TEXT FLY WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_188970
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۱-۵۴ Accession No. ۱۴۲۹۱

Author ح - م سید محمد علی شاہ 14291

Title خونناک دنیا

This book should be returned on or before the date last marked below.

خوفناک دنیا

حصۂ دوم

جزیرہ بورنیو میں سفر اور جنگلوں میں شکار

مصنفہٗ

ڈاکٹر سید محمد علی شاہ۔ سبزواری

ڈومیل کالج۔ چوک۔ آرہ (بہار)

بار اول۔ ایک ہزار

قیمت ۱ر

ع ۱۴۲۹۱

۵۴ ف

۹۱۰۵۳

مطبوعہ برکات اکبر پریس سبزی منڈی۔ الہ آباد

مصنف کا فوٹو ۱۹۳۸ع

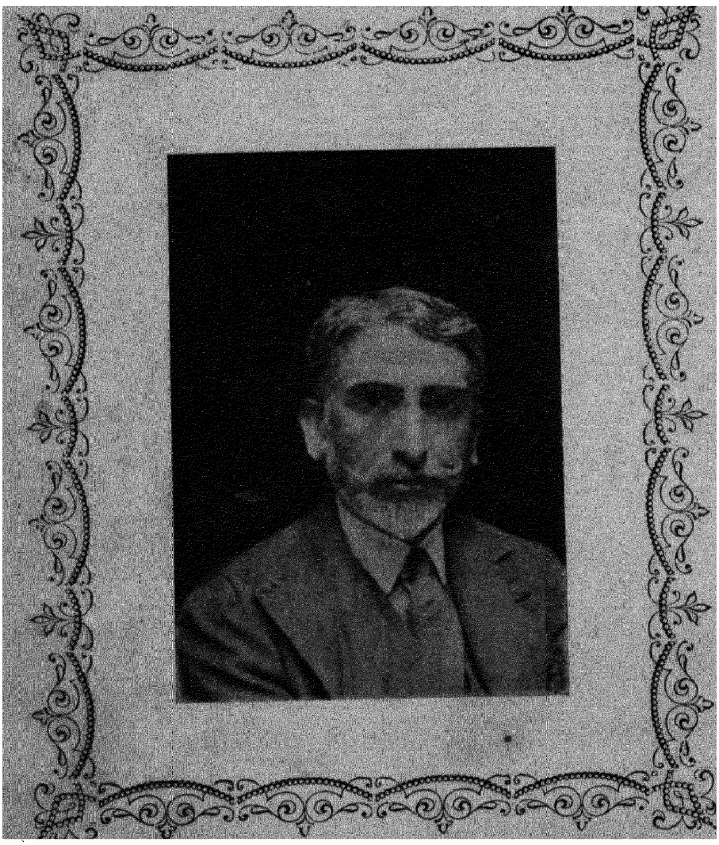

ڈاکٹر سید محمد علی شاہ سبزواری

فہرست کتاب

شمار	مضامین	صفحہ
	باب اول	
۱	میرا دوسرا سفر	۱
۲	راول	۱۰
	باب دوسرا	
۳	جزیرہ بورنیو	۲۱
	باب تیسرا	
۴	بحری چینی ڈاکو	۴۴
۵	شیانگ ڈاکو	۵۱
	باب چوتھا	
۶	ڈاکوؤں کی موت	۵۸
	باب پانچواں	
۷	ریاست سارا واک	۶۶

شمار	مضامین	صفحہ
۷	باب چھٹا	
۸	ریاست بروئی کے جنگلوں میں شکار	۷۷
	باب ساتواں	
۹	شیر کا شکار	۸۷
	باب آٹھواں	
۱۰	جنگلی بیل کا حملہ	۹۶
	باب نواں	
۱۱	کیلی جنگلیوں کا کیمپ پر حملہ	۱۰۸
	باب دسواں	
۱۲	قید تنہائی	۱۲۰
	باب گیارھواں	
۱۳	عمبو کی سرگذشت	۱۳۱
	باب بارھواں	
۱۴	فرار	۱۴۵

شمار	مضامین	صفحہ
	باب تیرھواں	
۱۵	جنگلوں میں سفر	۱۵۴
	باب چودھواں	
۱۶	حیرت انگیز انکشاف	۱۷۰
	باب پندرھواں	
۱۷	کیلی جنگلیوں کا قتل عام	۱۸۴
	باب سولھواں	
۱۸	جزیرۂ منڈناؤ (فلپائن) پُراسرار مکان	۲۰۲
	باب سترھواں	
۱۹	اصلی باشندے	۲۲۴
	باب اٹھارواں	
۲۰	رحمت خاں کی تلاش	۲۲۹

خوفناک دُنیا

حصۂ دوم

جزیرۂ بورنیو میں سفر اور جنگلوں میں شکار

باب اوّل

میرا دوسرا سفر

ماہ مئی سنہ ۱۹ء میں میں شملہ سے کوئیٹہ چلا گیا۔ وہاں کی آب و ہوا نے میری صحت پر بہت اچھا اثر کیا۔ میں جلد تندرست ہو گیا۔ چھ ماہ کے قریب میں کوئیٹہ میں رہا۔

اس دوران میں مجھے ڈاکٹر سمیتھ امریکن ڈینٹسٹ سے ملاقات کا اکثر موقع ملتا رہا۔ مجھے ڈینٹسٹری سیکھنے کا شوق بہت دنوں سے

تھا، لیکن کسی اچھی جگہ مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ڈاکٹر سمیتھ مجھے یہ کام مکمل طور پر سکھا دیں، مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور مشورہ دیا، کہ میں امریکہ جا کر وہاں کسی ڈنٹیل کالج میں داخل ہو کر باقاعدہ تعلیم حاصل کروں۔ اُن کی یہ رائے بہت معقول تھی۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ ہندوستان میں کوئی ڈنٹیل کالج موجود نہ تھا۔ میں نے اُن کا مشورہ پسند کیا، اور امریکہ جانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ انھوں نے مجھے وہاں کے چند ڈنٹیل کالجوں کے پتے نوٹ کرا دیئے، اور وہاں کے اخراجات اور سفر کے متعلق حالات بھی اُن سے معلوم ہوئے۔ امریکہ کے سفر کے لئے کم از کم سرِدست پانچ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔

یہ خیال لئے ہوئے میں کوئٹہ سے اپنے وطن ضلع جالندھر پنجاب میں واپس آیا، اور والد صاحب سے میں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے روپے کی امداد چاہی۔ یہ میں جانتا تھا کہ والد صاحب کے پاس اِس قدر روپیہ نقد نہیں ہے، لیکن وہ انتظام کر سکتے تھے۔ مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا پیش آگیا۔ والد صاحب اور کنبہ کے دیگر لوگ خاص کر والدہ ماجدہ میرے اِس ارادہ کے

بالکل خلاف تھیں، وہ رضامند نہ تھے کہ میں ہندوستان سے باہر دُور دراز سفر اختیار کروں۔ وہ خوش نہ تھے کہ میں چار پانچ برس گھر سے باہر رہوں۔

میں اپنے افریقہ کے سفر میں تنہا تھا، والدین کو صرف میری ہی فکر تھی، لیکن اب میں دو لڑکیوں کا باپ ہو چکا تھا، اور والدین چاہتے تھے کہ میں اپنے ہی مُلک میں کہیں نزدیک رہ کر اپنے کاروبار کو جاری رکھوں، اور دُور نہ جاؤں۔ مگر میرے سر پر امریکہ جانے اور وہاں جاکر ڈینٹسٹری سیکھنے کا بھوت سوار ہو چکا تھا، اور میرا ارادہ نہیں بدل سکتا تھا۔ مجھے کسی کی نصیحت یا سمجھانا بُرا معلوم ہوتا تھا۔ دو مہینہ تک مُتواتر گھر میں یہ جھگڑا رہا۔

امریکہ جانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ والد صاحب صاف انکار کر چکے تھے، میرے پاس صرف بچے بچائے چار پانچ سو روپے تھے، لیکن ان سے کیا ہو سکتا تھا؟ گو روپیہ میرے پاس نہ تھا، لیکن میری طبیعت میں ہمّت اور استقلال کی کمی نہ تھی، جس کو گھر والے بھی سب جانتے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ ضدّی انسان اپنے ارادہ سے باز نہیں آئے گا، روپے کی مدد کے بغیر بھی امریکہ پہنچ جائے گا۔ اور ضرور اپنے ارادہ میں کامیاب

ہوگا۔ میں اپنے ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے ملا۔ سنگاپور تک کا پاسپورٹ لیا، اور سفر میں اپنی رائفل ساتھ لیجانے کے لئے بھی انتظام کیا۔

سفر کے لئے تو میں تیار ہو گیا، مگر ابھی تک میرے سامنے کوئی پروگرام نہیں تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ گھر سے نکل کر کہاں جاؤں گا، کیا کروں گا، امریکہ کب اور کیسے پہنچوں گا۔ غرض میں گھر بھر کی مرضی کے خلاف ۲۴ دسمبر ۱۹۰۸ء کو گھر سے روانہ ہو گیا۔ اپنے گاؤں کے ایک مسلمان راجپوت لڑکے عنایت کو میں نے اپنے ساتھ کام کاج کے لئے لے لیا۔ مجھ سے چھوٹے، منجھلے بھائی میرے ساتھ انبالہ چھاؤنی تک آئے، وہاں سے وہ ڈیرہ دون چلے گئے اور میں ۲۵ دسمبر کی صبح دہلی پہنچا۔ ایک روز وہاں ٹھہرا۔ مجھے وہاں ایک عزیز دوست سے ملنا تھا، پھر کلکتہ ایکسپریس سے روانہ ہو کر تیسرے روز صبح ہی ہم کلکتہ پہنچ گئے۔ کلکتہ میں چند روز قیام رہا۔ جہاز کے سفر کا سامان درست کیا، سٹوو اور آرام کرسی اور کھانے پینے کا سامان خریدا گیا۔

میرا رُخ تو ضرور امریکہ کی جانب تھا مگر ابھی تک میرے ذہن میں کوئی پروگرام نہیں آیا تھا۔ صرف یہ خیال تھا کہ سنگاپور پہنچکر

آئندہ کے لئے کوئی پروگرام تیار ہوگا۔ تجارتی کاروبار میرے لئے کوئی نیا سلسلہ نہ تھا، دس برس سے میں مختلف تجارتوں کا تجربہ کر چکا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھے آخر تجارت ہی کا ذیعہ اختیار کرنا پڑے گا اور اسی ذریعہ سے مجھے اپنے ارادہ میں کامیابی ہوگی، میں نے کلکتہ سے کچھ گھڑیاں، چشمے اور کچھ فینسی سامان خرید لیا یہ ایسی چیزیں تھیں کہ سفر میں بارِ گراں نہ تھیں، اور ہر جگہ آسانی سے فروخت ہو سکتی تھیں۔ روانگی سے قبل میں نے کلکتہ پہنچنے اور جہاز کی روانگی کی تاریخ وغیرہ کی اطلاع والد صاحب کی خدمت میں لکھدی اور والدہ ماجدہ کی بہت کچھ تسلی تشفی کی۔

آخر جاپانی کمپنی کے کولمبو نامی جہاز کی روانگی کا دن آپہنچا۔ میں اپنا اور عنایت کا سنگاپور تک کا ٹکٹ کئی روز قبل خرید چکا تھا۔ ہم سامان لے کر بندرگاہ پر پہنچے۔ جہاز ابھی تک گودی میں آکر نہیں لگا تھا مگر پلیٹ فارم پر رنگون، پینانگ اور سنگاپور جانے والے مسافروں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ ہمارے پاس تھرڈ کلاس کے ٹکٹ تھے، مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر ہم کو جگہ اچھی نہ ملی تو جہاز میں تکلیف سے بسر ہوگی۔ جہاز کی آمد سے قبل دو قلی میرے پاس آئے اور کہا کہ اگر ہم کو چار روپئے انعام ملیں تو ہم آپ کے لئے عمدہ جگہ حاصل

کر کے سامان وہاں لگا دیں گے۔ میں نے منظور کر لیا۔ ۳ بجے کے قریب شام کو جہاز پہنچ گیا۔ ابھی پورے طور پر پلیٹ فارم کے ساتھ بھی لگنے نہ پایا تھا کہ بہت سے مسافر اور قلی جہاز میں کود گئے۔ ہمارے قلی پہلے دو چٹائیاں لے کر جہاز میں کود دے اور ایک جگہ پر دونوں چٹائیاں بچھا کر قابض ہو گئے۔ ایک قلی واپس آیا اور سامان ڈھونے لگا۔ جب سب سامان جا چکا تو ہم بھی گئے۔ قلیوں کی کوشش سے جگہ ہم کو اچھی مل گئی تھی۔ شام کو جہاز روانہ ہوا۔ عنایت سٹوو پر ناشتہ اور کھانا تیار کر لیتا تھا۔

ہندوستان سے اب میں کئی سالوں کے لئے جدا ہو رہا تھا۔ اپنے وطن اور عزیز و اقارب اور دوستوں کی جدائی کا صدمہ تھا۔ جہاز میں مسافروں کا بہت ہجوم تھا۔ رات کو دیر تک باجہ، ڈھولک، گانا بجانا لوگوں میں ہوتا رہا۔ تیسرے روز جہاز رنگون پہنچا، بہت سے مسافر یہاں اتر گئے۔ جہاز دن بھر یہاں ٹھہرا۔ میں عنایت کو سامان کے پاس چھوڑ کر شہر کی سیر کو چلا گیا۔ دن بھر خوب سیر کی۔ بدھ مندر اور دیگر تاریخی مقامات دیکھے، شام کو واپس آ گیا۔ رنگون نہایت بارونق شہر اور عمدہ بندرگاہ ہے، ہندوستانی لوگ بہت ہیں۔

کچھ لوگ یہاں سے بھی جہاز پر سوار ہوئے۔

کلکتہ سے ایک جرمن مسافر سنگاپور کے لئے سوار تھا اور میرے برابر ہی اُس کا بستر تھا، وہ انگلش جانتا تھا۔ جب وہ شام کو رنگون کی سیر سے واپس آیا تو ایک پیکٹ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا لائے ہو؟ اُس نے کہا، کیک لایا ہوں، اور پیکٹ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ جب میں نے اُسے کھول کر دیکھا تو عنایت جو میرے برابر کھڑا تھا قہقہہ لگا کر ہنسا، اس لئے کہ وہ کیک نہ تھے بلکہ ہندوستانی سفید گڑ کے ٹکڑے تھے جو انجینیر صاحب کیک سمجھے ہوئے تھے۔ رات کو جہاز رنگون بندرگاہ سے روانہ ہوگیا۔ پینانگ، سنگاپور اور اِن تمام علاقوں میں عام طور پر ملائی زبان بولی جاتی ہے۔ ایک بمبئی کے میمن پینانگ واپس جا رہے تھے، وہاں اُن کا کاروبار مدّت سے تھا۔ میں نے اُن سے ملائی زبان سیکھنا شروع کی۔ نوٹ بک میں سب لکھتا رہا۔ قلیوں سے بات چیت، بازار میں خرید و فروخت کے محاورے وغیرہ میں نے لکھ لئے۔ چوتھے روز ہمارا جہاز صبح ہی پینانگ بندرگاہ میں پہنچکر کنارے سے کچھ فاصلہ پر لنگر انداز ہوگیا۔ ڈاکٹری معائنہ کے بعد پینانگ کے مسافر اُتر گئے۔ یہ جزیرہ نمائے ملایا کا پہلا بندرگاہ ہے۔ ملائی لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں میوہ جات اور دیگر سامان

فروخت کے لئے ایک جہاز میں پہنچ گئے۔ ہندوستانی روپیہ سے ملایا کے ڈالر کو تبدیل کرنے والے چند دوکاندار بھی جہاز پر آگئے جو روپیہ کو ڈالر سے تبدیل کرتے تھے۔ پینانگ اور سنگاپور میں ڈالر کی قیمت ۱۲ تھی چاندی کا ڈالر روپیہ سے ذرا بڑا ہے۔ نوٹ اور ریزگاری بھی چلتی ہے۔ ڈالر ایک سَو پیسے کا ہوتا ہے۔ چونکہ جہاز کی روانگی کا نوٹس دوسرے روز صبح کے لئے تھا۔ ہم نے شہر میں جاکر خوب سیر کی۔ پینانگ بڑا شہر نہیں ہے۔ ملائی آبادی کے علاوہ چینی لوگ بھی کثرت سے آباد ہیں۔

ہندوستانی کاروباری لوگ بھی ہیں۔ ملائی اہل سنت وجماعت میں اُن کا لباس اور خوراک نہایت سادہ ہے۔ مچھلی اور چاول اُن کی خوراک ہے۔

دوسرے روز جہاز سنگاپور کو روانہ ہوگیا اور تیسرے دن صبح ہی ہم سنگاپور پہنچ گئے۔ سنگاپوری آبادی بہت بڑی آبادی ہے جو کہ میلوں پہلے سے شروع ہو جاتی ہے۔ دس بجے کے قریب جہاز بندرگاہ میں پہنچ کر لنگر انداز ہوگیا۔ ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ کشتیوں کے ذریعے ہم کنارے پہنچے، چنگی میں کچھ وقت صرف ہوا۔ پھر ہم رکشوں میں سوار ہو کر شہر کو روانہ ہوئے۔ ایک ملائی ہوٹل میں پہنچے، وہاں ایک کمرہ لیا سامان لگا دیا گیا۔

ہمارے وطن کے کچھ راول لوگ بہت عرصہ سے سنگاپور میں کاروبار کرتے تھے، میں نے اُن کو تلاش کر لیا۔ اُنھوں نے بہت کوشش کی کہ میں اُن کے ہاں مہمان رہوں، مگر میں نے ہوٹل ہی میں قیام پسند کیا۔

سنگاپور بہت بڑا شہر ہے، کلکتہ، بمبئی کی طرح بارونق ہے۔ یورپ اور امریکہ والوں کی بڑی بڑی دُکانیں موجود ہیں۔ چین اور جاپان کے لوگ بھی کاروباری ہیں، ہندوستانیوں کی بھی بہت سی دُکانیں ہیں۔ جن میں بمبئی کے مسلمان اور گجراتی ہندو اور سندھی لوگ قابل ذکر ہیں۔ بڑے بڑے یورپین ہوٹل ہیں۔ ہر ملک کے کونسل خانے موجود ہیں۔ غیر ممالک کے جہازوں کی بکثرت آمد و رفت نے سنگاپور کو ایک بہت بڑا بندرگاہ بنا دیا ہے۔ زبان عام طور پر ملائی ہے، انگریزی بھی بولی جاتی ہے، اس لئے کہ یہ سارے علاقے برطانیہ کے قبضہ میں ہیں۔ یہاں سکولوں کالجوں میں انگلش پڑھائی جاتی۔

یہاں رکشا کی سواری کا عام رواج ہے، جس کو چینا لوگ چلاتے ہیں۔ دو سواریاں بیٹھا کر صرف ایک چینا قلی دُور اور تیزی سے لے جاتا ہے۔ ہندوستانی اور پنجابی لوگ سڑکوں پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، جو یہاں مختلف کام کرتے ہیں۔

راول

مسلمانوں میں ایک قوم ہے جو راول کہلاتی ہے۔ پنجاب کے چند اضلاع میں یہ لوگ بہت پائے جاتے ہیں۔ خاص کر ضلع جالندھر میں اِن کی آبادی بہت ہے، اِن میں سے اکثر کے گوت راجپوتوں کے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اُن لوگوں کی اولاد ہیں جو وقتاً فوقتاً دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے یا لڑائی میں قیدی بنا لئے گئے اور رہا ہو کر اسلام میں شامل ہو گئے۔ چونکہ ہر دو حالات میں ہندو قانون کے مطابق ایسے لوگ جائداد کے وارث نہ ہو سکتے تھے اس لئے اُنھوں نے بجائے زمینداری کے اور کئی ایک پیشے اختیار کر لئے۔ اِن میں تعلیم کم ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اور دوسرے مُلکوں میں جا کر خوب روپیہ کماتے ہیں۔ تجارت، پھیری، حکمت اور ڈاکٹری کا پیشہ عام ہے، خاصکر آنکھوں کے علاج میں اِن کو خوب مہارت ہے۔ کئی ایک رمل، نجوم سے پیسے کماتے ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ لوگ اِن میں ایسے بھی ہیں، جو دھوکہ، چالاکی اور فریب دیکر روپیہ پیدا کرنا بُرا نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ وہ اس طریقۂ کار کو اپنا کمال فن سمجھتے ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ اپنے اِن کارناموں کو بیان کرتے ہیں۔ یہ لوگ پور

کی طرف بھی یہ لوگ بہت ہیں۔ اِن میں جو لوگ آنکھوں کا علاج کرتے ہیں وہ خوشحال ہیں اور بہت اچھی حالت میں ہیں۔ اتفاق سے تین راول ہمارے ہی ضلع کے رہنے والے جہاز میں میرے ہمسفر تھے اور سنگاپور تک جا رہے تھے۔ جہاز میں میرے پاس اُن کا سارا وقت گذرتا تھا، وہ ہمارے خاندان سے واقف تھے۔ اپنے گذشتہ واقعات اور چالاکیوں کے کارنامے وہ بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اُن کا ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے جو کہ قابلِ بیان ہے، ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ کس چالاکی سے اُنھوں نے ایک ڈرامہ کھیلا، اور کس دھوکہ سے ایک راجہ کو لوٹا۔

نظام الدین عُرف (جاموں) راول نے ہم کو اپنا قصّہ یوں سُنایا کہ وہ چند سال ہوئے گھر پر بیکار بیٹھے بیٹھے قرضدار ہو گئے، اور چند شادیوں نے اِس قرضہ میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ رات دن یہی فکر اُن کو کھا رہی تھی کہ اِتنی بڑی رقم کیسے ادا ہوگی۔ آخر اُنھوں نے آپس میں مشورہ کر کے سفر کا ارادہ کیا۔ سفر جانے کے لئے اِن کو قرض فوراً مِل جاتا ہے، اِس لئے کہ سب جانتے ہیں کہ یہ لوگ ہمیشہ سفر سے واپس مالامال آتے ہیں۔ یہ کُل پانچ آدمی تھے، جو سفر کو روانہ ہوئے، اور اِن پانچوں کو اپنے فن میں کمال حاصل تھا یعنی اوّل درجہ کے

چالاک اور دھوکہ باز تھے ، مگر اِن کے لئے یہ عیب نہ تھا بلکہ ایک ہُنر تھا۔

غرض گھر سے چلکر یہ لوگ بمبئی پہنچے - وہاں چند روز میں اِن کو خبر ملی کہ فلاں علاقہ میں ایک ہندو ریاست کے راجہ کے گھر میں کوئی اولاد نہیں ہے اور اُس کی عُمر پچاس برس کے قریب ہے - راجہ اور رانی اِس فکر میں رات دن مرے جا رہے ہیں - یہ خبر اس پارٹی کے لئے ایک بڑی خوشخبری تھی - اُنھوں نے ایک پروگرام تیار کیا اور بمبئی سے روانہ ہوگئے - جاموں اِن میں ایک بہت چلتا ہوا آدمی تھا - اُس ریاست میں پہنچکر اِس نے دو آدمیوں کو بازار میں ایک موقع کی دوکان لیکر نان بائی کا کام شروع کرا دیا - اِس سے اِن کی یہ غرض بھی تھی، کہ کامیابی کی تکمیل تک سب کو کھانے پینے کیلئے ملتا رہے - دُوکان کی پُشت پر دروازہ تھا - خود اپنے آپ کو اور باقی دو آدمیوں کو لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھا - نان بائی کا کام چلنے لگا ، اور اِن دونوں نے اپنے آپ کو لوگوں میں سگے بھائی ظاہر کیا - چھوٹے بھائی نے جاموں کی ہدایت کے مطابق دَم روکنے کی مشق شروع کی - آہستہ آہستہ اس کی یہ مشق بڑھتی گئی -

نظام الدین نے باقی دو آدمیوں کو برہمن کا لباس پہنایا پیشانی

پر تلک لگا کر شہر میں پھیری پر چھوڑ دیا، جو گلی کوچوں میں دن بھر "رام گنگا، رام جمنا، رام ساہوکار ہے" کی طرح صدا لگاتے پھرتے اور راجہ کے محل کے نیچے بھی ضرور دو ایک چکر لگا جاتے۔ دن کا کچھ حصہ مندر میں بھی گذارتے، اور رات کو دس بجے کے بعد چور دروازہ سے دکان میں پہنچ جاتے، اُس وقت مل کر کھانا کھاتے، اور مشورے ہوتے۔

جب یہ چاروں آدمی کام پر لگ گئے، تو اب چیف پارٹ کے لئے خود جاموں نظام الدین تیار ہوا۔ پہلے اُسترے سے اپنی داڑھی، مونچھیں اور سر کے بال سب صاف کر دیئے۔ کپڑے اُتار کر صرف ایک لنگوٹی باندھی، بدن اور منھ پر مٹی، کیچڑ اور سیاہی جو کچھ ملا لگا کر ایک مجذوب کی شکل بنائی، جس سے ایک عجیب صورت نکل آئی۔

ایک ہفتہ کے بعد سارے شہر میں ایک شور تھا، کہ شہر میں ایک کامل مست فقیر وارد ہوا ہے، جو کسی سے بات نہیں کرتا، کسی سے کچھ لیتا نہیں۔ اسی طرح اِن کے متعلق عام لوگوں میں قصّے شروع ہو گئے۔ کوئی کہتا کہ میں نے فقیر صاحب کو کل دس بجے شہر کے باہر فلاں جگہ دیکھا اور میری نظروں کے سامنے غائب ہو گئے۔ دوسرا کہتا کہ میں نے انکو اُسی وقت شہر کے فلاں حصّہ میں دیکھا۔ غرض عورتوں اور مردوں میں انکی کرامات کے تذکرے ہونے لگے۔ لوگ کہتے انھیں فقیر صاحب کے قدموں کی

برکت ہے جو اس سال شہر میں پلیگ کا نام نہیں ہے۔ دوسرا کہتا کہ یہ شہر والوں کی قسمت جاگی، جو ایسے صاحبِ کمال کا یہاں گذر ہوا۔

فقیر صاحب کی حالت یہ ہے کہ عجیب شکل ہے۔ کیچڑ میں لت پت ہیں، منھ سے کف جاری ہے، کچھ گنگناتے ہوئے اور دوڑتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ زیادہ وقت شہر سے باہر رہتے ہیں۔ صبح یا شام جب بازاروں میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے تو ایک آدھ چکر وہاں لگا جاتے ہیں، جہاں حالت اب یہ ہوتی ہے کہ جدھر سے یہ گذرتے ہیں لوگوں کا ہجوم اُن کے پیچھے دوڑتا ہوا ساتھ ہو لیتا ہے۔ کوئی مٹھائی اِن کے سامنے پیش کرتا ہے کوئی نقدی۔ مگر یہ اُن کی طرف ذرا توجہ نہیں کرتے۔ نیلی پیلی آنکھیں دکھاتے اور گالیاں دیتے ہوئے شہر سے باہر بھاگ جاتے ہیں۔ لوگ حیران ہیں۔ ہندو، مسلمان اِن کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں مگر یہ کسی کے قریب نہیں آتے۔ رفتہ رفتہ اِن کا یہ شہرہ اُمراء کے ذریعہ راجہ صاحب تک پہنچا۔ اِن کی اصل غرض بھی یہی تھی، جو کامیاب ہوتی نظر آرہی تھی۔

راجہ صاحب اور رانی صاحبہ کے کانوں تک اِن فقیر صاحب کے حالات وکمالات نہایت مبالغہ کے ساتھ پہنچے۔ وہ دونوں اُن کی زیارت کے لئے بے چین ہو گئے۔ اُن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرتے ہیں، اور کسی سے کچھ لیتے نہیں ہیں، نیز لوگوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

اسی طرح دو مہینے گذر گئے۔ لوگوں کی بے حد توجہ دیکھکر فقیر صاحب اب بازار میں بہت کم آتے ہیں۔ سب سے دُور دُور رہتے ہیں۔ عقیدمند لوگ اِن کی زیارت کے لئے بے چین ہیں، مگر یہ کسی کے نزدیک نہیں آتے۔

اُدھر نان بائیوں کا کام خوب چل رہا ہے، لوگوں میں رُسوخ بڑھ رہا ہے۔ دونوں پنڈت جی بدستور پھیری کر رہے ہیں۔ فقیر صاحب ہفتہ میں ایک آدھ چکر شہر کا لگا جاتے ہیں اور پھر جنگل میں غائب رہتے ہیں۔ کسی نے اُن کو سوتے اور کھاتے نہیں دیکھا۔ رات کو بدستور بھیس بدلکر دُکان میں پہنچ جاتے ہیں، دن بھر کی خبریں معلوم کر جاتے ہیں۔

جب اِن کو اس کا یقین ہوگیا کہ اب راجہ اور رانی بہت بے چین ہیں اور اُن کا حکم ہے کہ کسی طرح ایک دفعہ فقیر صاحب کو محل میں لایا جائے۔ تو اب ڈرامہ کا اصل کھیل کھیلنے کا وقت آگیا۔ مشورہ ہوا، پروگرام تیسرے روز ٹھیک دس بجے کا وقت مقرر ہوا۔

صبح ہوتے ہی لوگوں کو معلوم ہوا کہ نانبائی کا چھوٹا بھائی سخت بیمار ہے، اُس کو نمونیا ہوگیا ہے اور سخت درد میں مُبتلا ہے۔ حکیم آئے، ڈاکٹر آئے، دوائیں پلائی گئیں، مگر کچھ آرام نہیں ہوتا، درد میں ذرا کمی نہیں ہوتی۔ وہ درد کی تکلیف سے چلّا رہا ہے، اُس کے بھائی نے رُو رُو کر بُرا حال کر لیا

ہے۔ لوگوں کو ہمدردی ہے، وہ آتے ہیں اور اپنی خدمت پیش کرتے ہیں، لیکن مریض ہے کہ اُس کو کسی طرح آرام نہیں ہو رہا ہے۔

تیسرے روز صبح ہی نانبائی کی گریہ و زاری سے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ رات کو اُس کا بھائی مر گیا ہے۔ پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے سب کو بہت افسوس اور صدمہ تھا۔ کوئی مُردہ کو جا کر دیکھتا تو وہ اپنا دم روک لیتا جس کی مشق وہ کر چکا تھا۔ اب غسل ہوا، کفن پہنایا گیا۔ ٹھیک پونے دس بجے جنازہ تیار کر کے دوکان کے سامنے سڑک پر رکھ دیا۔ سیکڑوں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے۔ نانبائی اپنے بھائی کی میت پر روتے روتے پاگل ہو گیا۔ لوگ تسلّی دیتے لیکن وہ کسی کی نہ سُنتا۔ جب ٹھیک دس بجے تو لوگوں میں ایک ہنگامہ ہوا، اور شور مچ گیا کہ فقیر صاحب آ گئے۔ اُنھوں نے آتے ہی بڑے جذبہ میں پوچھا کہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا، حضور! یہ غریب پر بیسی لُٹ گیا، اِس کا جوان بھائی رات مر گیا ہے۔ اُدھر جب نانبائی نے فقیر صاحب کو دیکھا تو روتے ہوئے دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور چلّانے لگا۔ فقیر نے اُس کو بہت گالیاں دیں مگر اُس نے قدم نہ چھوڑنے تھے نہ چھوڑے۔ آخر فقیر نے کہا۔ "اچھا چھوڑ دے۔ مجھے تیرے حال پر رحم آ گیا، ہمارے پیر چھوڑ دے، تیرا بھائی زندہ ہو گیا۔" فقیر صاحب نے کچھ بڑبڑایا اور ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھا کر لاش پر پھینکا۔

پتھر کا پڑا تھا، کہ مُردہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ فقیر صاحب تو اب غائب تھے۔ لوگوں نے کفن کھولا، مُردہ کو زندہ دیکھ کر مخلوق کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دونوں بھائی گلے ملے۔ اَب کیا تھا؟ سارے شہر میں ایک ہنگامہ تھا۔ دیہاتوں میں، کُل علاقے میں اِس واقعہ کی دُھوم مچ گئی۔ فقیر صاحب کو لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں، مگر اُن کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

جب یہ خبر محل میں پہنچی، تو راجہ نے سر پیٹ لیا، کہ ایسا صاحبِ کمال ہمارے شہر میں ہو، اور ہم کسی نعمت سے محروم رہیں۔ آخر راجہ نے یہ انتظام کیا۔ کہ بہت سے لوگوں کو انعام کا وعدہ دیکر اِس کام پر مقرر کیا، کہ جس طرح ہو سکے فقیر صاحب کو محل میں لایا جائے۔ اب دو دو آدمی گاڑی ساتھ لے کر فقیر صاحب کی تلاش میں سڑکوں پر اور باہر جنگلوں میں سارا دن گھومتے پھرتے ہیں کبھی اتفاق سے فقیر صاحب نظر پڑ گئے، تو دوڑ کر اُن کے سامنے پہنچے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ جذبہ میں پوچھا۔ "کیا ہے؟" تو نیچی نظریں کئے ہوئے جواب ملا۔ "حضور کو راجہ صاحب یاد کر رہے ہیں"۔ غصّے میں بولے۔ "ہم راجہ صاحب کے نوکر نہیں ہیں، جاؤ نہیں جاتے"۔

کچھ روز تک اِس ڈرامے کا یہ حصّہ یوں ہی چلتا رہا۔ آخر ایک

روز تنگ آکر فقیر صاحب نے کہا کہ "تمھارے راجہ نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے، جاؤ اُس سے کہدو، کہ کل ٹھیک ۹ بجے گاڑی یہاں جنگل میں بھیجے"۔ اِس خبر کے پہنچتے ہی محل میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔ انعام دیئے گئے، غریبوں کو کھانے کھلائے گئے۔ اب راجہ صاحب کو اپنی مُرادیں بر آتی نظر آئیں، دو چار بیٹے کھیلتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ خدا خدا کر کے کل ہوئی۔ وقت مقررہ سے قبل ہی گاڑی جنگل میں پہنچ چکی تھی۔ ۹ بجے فقیر صاحب بھاگتے ہوئے جنگل سے برآمد ہوئے۔ کیچڑ میں لت پت ہیں، مُنھ سے کف جاری ہے۔ آتے ہی گاڑی میں مخمل کے گدّے پر بیٹھ گئے۔

اُدھر محل کے اندر استقبال کا پُورا سامان ہو رہا تھا۔ راجہ صاحب اور بہت سے لوگ باہر موجود تھے۔ گاڑی کے پہنچتے ہی خوشی اور جے کے نعرے بلند کئے گئے۔ فقیر صاحب کو ہاتھوں ہاتھ محل کے بالائی حصّہ میں ایک شاندار کمرے میں لے گئے اور ایک بڑی کرسی پر بیٹھا دیا گیا۔ خود راجہ صاحب اور سب اہلکار ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔

اب فقیر صاحب غُصّہ میں یوں گویا ہوئے:۔ "راجہ! تو نے ہم کو بہت دُکھ دیا ہے، تو بڑا پاپی ہے۔ اچھا مانگ، کیا مانگتا ہے؟"۔

راجہ صاحب نے دھیمی آواز میں فرمایا۔ حضور! ہم نے بہت مجبور ہوکر آپ کو تکلیف دی ہے، ہمارے ایسے بھاگ، کہ حضور کے قدم ہمارے شہر میں آئیں اور ہم اولاد سے محروم رہیں"

جواب ملا۔ اچھا منظور، جاؤ تم کو بیٹا ملے گا، لیکن جیسا ہم کہیں دان کرو، بغیر رُو رعایت ایسے غریبوں کو دان دو، جو حقدار ہوں۔

دیکھو راجہ! کل اِس وقت تک ۲ دو سونے کی گائیں، ہر ایک کا وزن پانچ ۵۰۰ سو تولہ سے کم نہ ہو۔ ایک سونے کا بچھڑا، جس کا وزن دو ۲۰۰ سو تولہ ہو، تیّار رہیں۔ ۲ دو سیر ماش، ۲ دو سیر تِل بھی موجود رہنا چاہیئے۔ اور کل ٹھیک ۵ بجے گاڑی بھیجو۔ یہ کہتے ہی فقیر صاحب جواب کا انتظار کئے بغیر اُٹھکر بھاگ گئے۔

بھلا وہاں یہ سب سامان مہیّا ہونے میں کیا دیر ہو سکتی تھی، سُناروں کو آرڈر ملا۔ سونے کی گائیں اور بچھڑا تیّار ہو کر آ گئے۔ دوسرا دِن ہوا۔ وقت پر گاڑی حاضر ہوئی، محل میں فقیر صاحب پہنچے، اور سب سامان اِن کے سامنے پیش کئے گئے۔ سب دست بستہ کھڑے تھے۔ سامان کی دیکھ بھال ہو رہی تھی اور ایک خاموشی طاری تھی، کہ اِتنے میں محل کے نیچے سے صدا آئی " رام گنگا، رام جمنا، رام ساہوکار ہے " فقیر نے گردن اُٹھائی، پوچھا" یہ کون لوگ ہیں جو نیچے بول رہے

ہیں؟" جواب ملا، کہ یہ دو پنڈت ہیں، جو باہر سے آئے ہوئے ہیں، پھیری میں صدا لگاتے پھرتے ہیں۔ حکم ہوا۔ فوراً اُن کو اُوپر بُلاؤ۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ سامنے آتے ہی پوچھا، تم لوگ کون ہو؟ اِسکے جواب میں وہ دونوں رونے لگے، اور کہنے لگے کہ ہم تین مہینے سے اس اندھیر نگری میں بھوکے پیاسے گھوم رہے ہیں، اور کوئی ہمارا پُرسانِ حال نہیں ہے۔ ہم بہت غریب ہیں اور پردیسی ہیں۔ فرمایا۔ اچھا آگے آؤ! بچھاؤ اپنی چادر، اُٹھاؤ یہ دونوں گائیں، بچھڑا بھی اُٹھاؤ، یہ ماش اور تل بھی لے جاؤ۔ اُٹھاؤ جلدی اُٹھاؤ۔ بھاگو یہاں سے۔ چلے جاؤ، مردُود کہیں کے۔ اب تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ پھر بولے۔ اچھا راجہ! دان ہوا، اب پُوجا کا سامان کرو، کل پوجا ہوگی۔ ٹھیک وقت پر گاڑی بھیجو۔ یہ کہتے ہی اُٹھ کر بھاگ گئے۔

دوسرے روز صبح کو وہاں نہ نانبائی تھے نہ وہ پنڈت تھے، اور نہ کہیں فقیر صاحب کا پتہ تھا۔ کچھ عرصہ اخباروں میں چرچا رہا۔ پولیس دوڑ دھوپ کرتی رہی۔ یہ پارٹی اپنا کامیاب سفر کرکے واپس وطن پہنچ چکی تھی۔

باب دوسرا

جزیرہ بورنیو

سنگاپور میں مجھے ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ میں ہمہ تن اپنی اسکیم کی کامیابی کے لئے کوشاں تھا۔ روپئے کی کمی کی وجہ سے میں براہِ راست امریکہ جانے کا ارادہ نہیں کرسکتا تھا، اس لئے اب میرے پروگرام کی صورت یہ تھی کہ کسی طرح میں فلپائن میں داخل ہونے کی کوشش کروں اور ہانگ کانگ کے راستہ سے فلپائن کے بڑے شہر منیلا میں داخل ہوجاؤں۔ وہاں داخلہ کے بعد میری دونو مشکلات کا حل ہوجائیگا۔ فلپائن امریکہ گورنمنٹ کے تحت میں ہے۔ وہاں سے امریکہ جانے کے لئے مجھے کوئی دشواری نہ ہوگی، اور نہ پاسپورٹ کی ضرورت پڑے گی۔

مجھے وہاں یہ بھی اُمید تھی، کہ فلپائن میں تجارت کے ذریعہ سفر امریکہ کے لئے کچھ زادِ راہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں ایک روز سنگاپور میں امریکن قونصل سے ملا، اور اُن سے فلپائن

میں داخلہ کے لئے پاسپورٹ کی درخواست کی۔ اُنھوں نے یہ کہا کہ امریکہ اور فلپائن میں ایشیا والوں کے داخلہ کا سوال اب بہت مشکل ہوگیا ہے۔ امریکن گورنمنٹ کا قانون اس کے لئے بہت سخت ہے، اس لئے پاسپورٹ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اس جواب سے میں بہت مایوس ہوا، اور واپس آگیا۔ میں اس وقت نہایت پریشان تھا۔ اب میرے امریکہ جانے میں دو مشکلات تھیں۔ روپیہ کی کمی کا سوال تو پہلے سے موجود تھا، لیکن وہاں داخلہ کا دوسرا مشکل سوال پیدا ہوگیا۔ اب میں کروں تو کیا کروں، امریکہ جانے کا پورا تہیہ کرچکا تھا، اور گھر سے یہی عزم کرکے نکلا تھا، مگر یہاں میرے راستہ میں مشکلات کے پہاڑ سدِّ راہ تھے۔ اسی طرح ایک ہفتہ سرگرداں اور پریشان پھرتا رہا، اور اسی دوران میں ایک روز میں انگریزی قونصل سے جاکر ملا، اور اس بارے میں اُن سے اِمداد کی درخواست کی مگر وہاں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اَب مجھے اَمریکہ کا دروازہ اپنے سامنے بند نظر آنے لگا۔

مگر ان مایوسیوں کے اندر بھی مجھے ایک ہلکی سی اُمید محسوس ہوتی تھی۔ میرے دل میں ہمیشہ یہ خیال رہا، کہ کوشش سے انسان سب کچھ کرسکتا ہے، گو اس وقت میری ساری کوششیں بیکار ثابت

ہو رہی تھیں، مگر میں کوشش برابر کرتا رہا۔

ایک روز میں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا تھا، اور دُنیا کا نقشہ کھلا ہوا میرے سامنے میز پر پڑا تھا، اور میں بغور اُس کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سنگاپور سے بورنیو بہت قریب ہے، اور بورنیو سے فلپائن کا جنوبی حصّہ ملا ہوا ہے، یہ دیکھتے ہی فوراً میرے دماغ میں یہ بات آئی، کہ مجھے اس وقت بورنیو چلے جانا چاہیئے، اور وہاں سے فلپائن میں داخلہ کی کوشش آسانی سے ہو سکے۔ یہ خیال کرتے ہوئے میں نے بورنیو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس کے سوا میرے لئے اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا، مجھے سنگاپور میں بیس روز کے قریب گذر چکے تھے۔

جب میں بورنیو جانے کا پختہ ارادہ کر چکا تو سنگاپور سے میں نے کچھ مال اور خریدا۔ کولمبو کے بنے ہوئے انگوٹھیوں میں لگانے کے پتھر زمرّد، پکھراج، نیلم، یاقوت وغیرہ مجھے بہت سستے مل گئے، جو بالکل اصلی پتھروں کا مقابلہ کرتے تھے، یہ اتنے خوشنما اور نفیس تھے کہ میں نے دوسرے مُلکوں میں اِن کے ذریعے بہت روپیہ پیدا کیا۔ خرچ کیلئے کچھ روپیہ رکھکر باقی سب کا میں نے مال خرید لیا تھا۔ سفر کا انتظام کرنے کے بعد میں نے عنایت کو ساتھ لیا اور جزیرۂ بورنیو کے لئے جہاز پر سوار ہو گیا۔ سنگاپور سے ہر پندرہ روز کے بعد بورنیو کو جہاز روانہ ہوتے

تھے، یہ ایک جرمن کمپنی کا جہاز تھا، جو کہ برٹش نارتھ بورنیو کو جا رہا تھا، اور ہمارے ٹکٹ سنڈیکن تک تھے۔ سمندر کے سفر کیلئے موسم خوشگوار تھا۔ جہاز چار روز کی مسافت کے بعد بورنیو کے پہلے بندرگاہ لابون پہنچا۔ جہاز گودی کے ساتھ لگا دیا گیا تھا، اس لئے ہم آسانی سے خشکی پر اتر کر آبادی میں چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ بورنیو ایک گم نام سا جزیرہ ہے، یہاں ہندوستانی کم آتے ہوں گے، مگر خشکی پر اترتے ہی میں نے پنجابیوں کو کثرت سے دیکھا، اور معلوم ہوا کہ سارے برٹش نارتھ بورنیو میں ملیٹری اور پولیس میں سب پنجابی ہیں، جو زیادہ تر سرحد کے ضلع ہزارہ کے رہنے والے ہیں۔ یہاں کچھ فاصلہ پر ان کی بارکیں اچھے موقع پر بنائی گئی ہیں۔ چند سرحدیوں نے اخلاقاً مجھے اپنی بارگ میں جانے کے لئے مجبور کیا، وہاں انھوں نے میرے کھانے کی دعوت کی۔

لابون ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو بورنیو کی زمین سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سمندر کے کنارے لابون ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ میوہ کی مارکیٹ بھی ہے۔ ہم نے کیلا، نارنگی اور انناس خریدے۔ یہ ہندوستان سے سستے تھے۔ بورنیو میں بھی عام طور پر ملائی زبان بولی جاتی ہے اب میں یہ زبان کچھ بول لیتا تھا۔

یہاں سے روانہ ہونے کے بعد جہاز تیسرے روز جیسلٹان پہنچا۔ یہ

بڑی بندرگاہ ہے اور یہاں آبادی بھی خاصی ہے، بازار ہے چینی لوگوں کی بہت سی دُوکانیں ہیں۔ یہاں ملٹری پولیس بھی زیادہ ہے۔ سمندر کے کنارے سے ایک چھوٹی ریلوے ۱۲۵ میل اُوپر جنگل تک گئی ہے، جو جنگل کی پیداوار عمارتی لکڑی کے علاوہ، تمباکو، ربڑ، گٹاپرچہ ساگودانہ، کافور وغیرہ لاکر جہازوں تک پہنچانے میں بڑی مدد دے رہی ہے۔ فروٹ یہاں بھی کثرت سے ہیں۔ جہاز یہاں سے روانہ ہوکر کڈرت ہوتا ہوا تیسرے روز صبح سنڈیکن پہنچا۔ جہاز کے وہاں پہنچتے ہی ہم نے بہت سے پنجابیوں اور ہندوستانیوں کو دیکھا۔ کچھ یورپین بھی تھے۔ وہاں پہنچکر مجھے معلوم ہوا کہ سنڈیکن میں کوئی ہوٹل نہیں ہے، مگر مکان آسانی سے کرایہ پر مل جائے گا۔ ہم کو دو گھنٹے کسٹم ہوس میں اپنے بکس اور مال دکھانے اور محصول چنگی وغیرہ میں لگ گئے۔ چند پنجابیوں کی کوشش سے ہم کو ایک اچھا مکان مل گیا، اور سامان وہاں پہنچادیا گیا۔

جزیرۂ بورنیو ایک بہت بڑا جزیرہ ہے، دُنیا میں اِس کا تیسرا نمبر ہے۔ یہ ٹھیک چین اور آسٹریلیا کے درمیان واقع ہے۔ اِس کے شمال میں چین اور جنوب میں جاوا۔ مغرب میں سماٹرا اور مشرق میں سیلبس کے جزائر ہیں۔ اِس کا رقبہ تین لاکھ مربع میل کے قریب ہے۔ اِس جزیرہ کو اگر تین حصّوں میں تقسیم کیا جائے تو دو حصے

ڈچ گورنمنٹ کے قبضہ میں ہیں، باقی تیسرا حصہ جو شمال اور مغرب میں واقع ہے، وہ برٹش نارتھ بورنیو گورنمنٹ اور ریاست سارا ورک کے قبضہ میں ہے۔ اِن دونوں کے درمیان (ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست برونی ہے) برٹش نارتھ بورنیو کی گورنمنٹ ایک کمپنی ہے، جو برٹش نارتھ بورنیو چارٹرڈ کمپنی کے نام سے مشہور ہے اور سنڈیکن اِس کا صدر مقام ہے۔ اِس کمپنی کی طرف سے سِکّہ، سٹیمپ وغیرہ جاری ہے۔ ڈالر ۱۲؍عہ کے اندازے میں ہے۔

جزیرہ میں پہاڑ کثرت سے ہیں، دراصل یہ جزیرہ ہی پہاڑوں کا ہے۔ یہاں دریا بھی بہت ہیں، جو سارے ملک کو سیراب کرتے ہیں۔ گھنے جنگل بکثرت ہیں۔

آب و ہوا یہاں کی مرطوب ہے۔ بارش کا موسم یہاں اکتوبر سے مارچ تک ہے۔ جزیرہ میں جنگلوں کی کثرت کی وجہ سے یہاں عمارت کے مصرف کے لئے مختلف قسموں کی لکڑی بکثرت پیدا ہوتی ہے، جو ساری دُنیا میں روانہ ہوتی ہے۔ آئرن ووڈ یہاں کی مشہور عمارتی لکڑی ہے، جو لوہے کی طرح وزنی ہوتی ہے، اور پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ اسکے علاوہ جنگلوں کی پیداوار ربڑ، تمباکو، کافور، ساگودانہ اور گٹاپرچہ وغیرہ بہت ہیں۔ سارے جزیرہ میں کانوں کی کثرت ہے، جن میں لوہا، کوئلہ، سُرمہ،

پیٹرول، پارہ، سونا، پلاٹینم اور ہیرے کی کانیں ہیں۔

دریاؤں اور ندی نالوں کی کثرت کی وجہ سے ہر چہار جانب سبزہ زار ہے۔ یہاں کے اصلی باشندے ڈیکز کہلاتے ہیں، جن کا مذہب اسلام ہے۔ اور بہت سی قومیں جنگلوں اور پہاڑوں میں آباد ہیں۔ وہ غیر مہذب اور وحشی لوگ ہیں، جن کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ ڈیکز جو سمندر کے کناروں کی آبادی میں، اور شہروں میں رہتے ہیں غیر مہذب نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی خوراک اور لباس بہت سادہ ہے۔ عرب تاجروں کی آمد سے یہاں اسلام پھیلا۔ عربوں کے بعض رسم و رواج اب بھی ان لوگوں میں موجود ہیں۔ دکانداری، ملازمت اور کاشتکاری ان کا پیشہ ہے۔ بعض ان میں تعلیم یافتہ لوگ بھی ہیں جو سرکاری ملازم ہیں۔ اسلام کی مذہبی تعلیم بھی ان لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ سنڈیکن میں چند مسجدیں بھی ہیں۔ زیادہ تر یہاں دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ شہروں کے قریب سبزی، ترکاری اور پھل وغیرہ کی بھی کاشت کیجاتی ہے۔

ان لوگوں کے مکانات، سارے بورنیو میں عجیب و غریب ہیں، جنھیں لکڑی، بانس اور گھاس سے بناتے ہیں۔ سمندر اور دریا کے پانی کے اندر بڑی بڑی لکڑیاں گاڑ کر ان پر بانس کا فرش تیار کر کے پھر کمرے اور مکان بناتے ہیں۔ گھاس کی چھت ڈالتے ہیں اور

آمد و رفت کے لئے ایک چھوٹا سا پُل بنا دیتے ہیں۔ پانی کے اندر یہ مکان نہایت عمدہ اور صاف ستھرے ہیں۔ خشکی پر جو مکان بناتے ہیں وہ بھی اسی طریقہ سے بناتے ہیں اور زمین سے سات آٹھ فیٹ اُونچے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کے مکان تو دریا کے وسط میں دیکھے گئے ہیں۔ اُن کی آمد و رفت کشتی کے ذریعہ ہے۔ اِن کی خوراک گوشت، سبزی مچھلی اور چاول ہے۔

بورنیو کی زمین کاشت کے لئے ایسی زرخیز نہیں ہے، جیسی جاوا اور سماٹرا کی ہے، اس لئے کہ بورنیو میں پہاڑ اور جنگل زیادہ ہیں۔ بورنیو کے وسطی حصّہ میں ابھی ہزاروں میل رقبہ پڑا ہوا ہے، جس میں صرف وحشی قومیں آباد ہیں۔ وسط میں مولو پہاڑ ۹ ہزار فیٹ بلند ہے، اور گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا ہے، اور کوہ آئرن بھی اسی کی طرح ملک کے درمیانی علاقہ میں واقع ہے۔

سب سے بلند پہاڑوں کا سلسلہ شمالی حصّہ بورنیو میں ہے، جو کینا بالو کے نام سے مشہور ہے، اور اس کی چوٹیاں تیرہ ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔ اِس سلسلۂ کوہ سے بہت سے دریا نکلکر سارے ملک کو سیراب کرتے ہوئے سمندر میں مِل گئے ہیں۔ بعض حصّہ میں آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں۔

جنگلی سُور، ہرن اور سانبر سارے جنگلوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو فصلوں اور کھیتی کو خراب کرتے ہیں۔

اِن جنگلوں میں ایک خاص قسم کا جانور پایا جاتا ہے، جو بھاری بدن کا، گینڈے کی قسم کا جانور ہے، مگر گینڈے سے قد و قامت میں چھوٹا ہے۔ مُنھ پتلا اور لمبا، اُس پر ناک لمبی ہوتی ہے۔ کان چھوٹے، سارے جسم کا رنگ سیاہ اور کمر کا حصّہ سفید۔ اِس کو یہاں ٹیپر کہتے ہیں۔ چھوٹے قد کے شیر، چیتے اور ریچھ بھی اِن جنگلوں میں بھرے پڑے ہیں۔

شمالی بورنیو کے پہاڑ کے قُرب و جوار کے جنگلوں میں جنگلی ہاتھی بہت کثرت سے پایا جاتا ہے، جو سیاہ رنگ کا اور پستہ قد ہوتا ہے۔ اگرچہ اِس کا قد چھوٹا ہوتا ہے، مگر یہ بلا کا شریر اور ضدّی جانور ہے۔ اِن کے علاوہ بیسیوں قسم کے بندر تمام جنگلوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، اِن میں بڑی قسم کا بندر گوریلا سے مِلتا جلتا (بَن مانس) بھی ہے، جس کا قد چار پانچ فیٹ تک بلند ہوتا ہے۔

بورنیو کے بعض جنگلوں میں جو خاص مشہور جانور ہے، وہ جنگلی بیل ہے، جو نہایت خونخوار ہے، اِس کے سینگ چار چار فیٹ لمبے ہوتے ہیں۔ یہ جانور گھنے جنگلوں میں دریا کے کناروں پر پایا جاتا ہے۔

بہت سی قسم کے سانپ بھی ہیں، جن میں بعض بہت بڑے بڑے

ہوتے ہیں۔ دریاؤں اور نالوں میں گھڑیالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔
برطانوی شمالی بورنیو میں سنڈیکن سب سے بڑا شہر ہے، لیکن اس کی آبادی دس ہزار سے زائد نہیں ہے۔ سنگاپور۔ آسٹریلیا۔ چین سے جہازوں کی آمد و رفت نے اس کو بارونق بنا رکھا ہے، چینیوں کی آبادی یہاں خاصی ہے۔ تجارتی کار سب انھیں لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ شہر کے پختہ مکانوں کا سلسلہ سمندر کے کنارے دور تک چلا گیا ہے۔ بازار اور مارکیٹ میں بہت رونق ہے۔ پولیس اور ملیٹری میں پانچ سو کے قریب پنجابی ہیں جو ہزارہ اور دیگر اضلاع کے رہنے والے ہیں۔

سبزہ زار کے دلفریب مناظر ہر طرف ہیں۔ ان کے اندر یورپینوں کے سفید سفید بنگلے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پوسٹ آفس، ہسپتال اور کچہری وغیرہ کی عمارتیں بازار سے قریب ہیں۔ انگریزی کلب بھی عمدہ موقع پر ہے۔ ایک پہاڑی پر امرکین قونصل کا بنگلہ بھی ہے۔ میں نے چند روز سیر اور ملاقاتوں میں گذارے۔ انگریز افسروں سے ملا۔ امرکین قونصل سے ملاقات کی، ان کی عمر اسوقت ستر برس کی تھی، صرف ایک بیٹی ساتھ تھی، اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے پاسپورٹ کی غرض سے ملاقات کا سلسلہ ان سے جاری

رکھا، اکثر میں اُن سے ملتا رہا۔

کلب میں بھی مُلاقات ہوجاتی تھی۔ میں نے سنڈیکن میں اپنا کاروبار شروع کردیا تھا، خریداروں کی آمد و رفت میرے مکان پر رہتی تھی۔ یورپین لوگ بھی آجاتے تھے۔ اِن لوگوں میں کولمبو کے قیمتی پتھر بہت پسند ہوئے، اور بہت منافع کے ساتھ فروخت ہوتے رہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سارا مال فروخت ہوگیا، اور میرے پاس ایک ہزار روپئے کے قریب نقد ہوگیا، جس سے میری تجارتی دلچسپی بہت بڑھ گئی۔ میں نے اِرادہ کیا کہ میں خود سنگاپور جاکر نیا مال خرید کر لاؤں۔

سنڈیکن سے باہر دُور دُور جنگلوں میں یورپینوں کے فارم قائم ہیں جن میں ربڑ اور تمباکو وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے، اور ہر ایک فارم میں یورپینوں کی خاصی آبادی رہتی ہے۔ میرا یہ ارادہ بھی ہوا کہ نئے مال کے ساتھ اِن فارموں کا گشت بھی لگاؤں اور ساتھ ہی شکار کا لُطف بھی حاصل کروں۔

چنانچہ میں عنایت کو سنڈیکن چھوڑ کر سنگاپور روانہ ہوگیا، اور بیس روز کے بعد مال لے کر واپس آگیا، اور دورہ پر جانے کی تیاری شروع کی۔ سفر کا سامان دُرست کیا، رائفل اور شکار کا

سامان ٹھیک کیا، اور جیسلٹان کا سفر کرنے کے لئے تیار ہو گیا، تاکہ وہاں سے ریلوے کے ذریعہ آسانی سے جنگلوں میں جا سکوں۔

ایک روز شام کو کلب میں میرے ایک دوست نے میرا تعارف ایک نوجوان انگریز سے کرایا، جو کینیا بالو پہاڑ کے قریب مقام سیگاماں میں تمباکو فارم کے منیجر تھے۔ اُن سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں اُن کے اِرد گرد اور بہت سے فارم ہیں، جن میں بہت سے یورپینوں کی آبادی ہے، اور وہاں شکار بھی خوب ہے۔ شکار کے ذکر کے دوران میں اُنھوں نے کہا کہ آپ سیگاماں ضرور آئیں اور میرے ہی ہاں بنگلہ میں ٹھہریں، آپ کو کاروباری کامیابی کے علاوہ شکار بھی خوب خاطر خواہ ملے گا۔ میں بورنیو کے جنگلوں، پہاڑی نظاروں اور وہاں کے شکار سے حظ حاصل کرنے کے لئے بہت بیتاب تھا۔ منیجر صاحب دوسرے روز واپس گئے۔ میں چار روز کے بعد عنایت کے ساتھ سامان لے کر ایک چھوٹے بادبانی جہاز کے ذریعہ سیگاماں کو روانہ ہو گیا۔ ڈوڈیکز باپ، بیٹے اِس جہاز کو چلا رہے تھے۔ دوسرے روز صبح ہی ہم مقام ٹیوا پہنچے۔ سمندر کے کنارے پر یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے، اور وہاں کوئلہ کی کان کی وجہ سے چند انگریز رہتے ہیں، اور تھوڑے سے چینی اور ڈیکز قلیوں

کی آبادی ہے۔ ہم دو گھنٹے یہاں ٹھہرے، پھر روانہ ہوگئے۔ ایک روز سفر کے بعد دوسرے دن صبح ۹ بجے لاحد ڈاٹو پہنچ گئے۔ اب جہاز کا سفر ختم ہوگیا تھا۔

یہ مقام نہایت خوش منظر ہے، سامنے دُور تک سمندر کی لہریں بل کھاتی دکھائی دیتی ہیں، جس میں جابجا ماہی گیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اپنے بادبانوں کے ساتھ اِدھر سے اُدھر چلتی پھرتی عجیب بہار دیتی ہیں۔ سمندر کے کنارے، پانی کے اندر اور خشکی پر مقامی لوگوں کے مکانات دُور تک پھیلتے چلے گئے ہیں، اِن کی پشت پر سرسبز و شاداب پہاڑیں۔ بلندی پر بھی کچھ مکانات نظر آتے ہیں۔ یہاں سے کوہ کینابالو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مختلف مقامات پر تمباکو اور ربڑ کے فارم ہیں۔ بازار اور مارکیٹ بھی ہے۔

یہاں سے سیگاماں جانے کے لئے چھوٹی ریلوے لائن ہے سیگاماں یہاں سے دس میل ہے۔ ۱۱ بجے کے قریب ٹرین یہاں پہنچگئی اور ہم اُس میں سوار ہوئے جو ایک گھنٹہ بعد ۱۲ بجے روانہ ہوگئی۔ لائن کے دونوں جانب گھنے جنگل اور پہاڑ تھے۔ چھوٹے بڑے ہرن کثرت سے گھاس چرتے اور دوڑتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ گاڑی ایک گھنٹہ چلنے کے بعد یکایک ٹرک کر زور سے وِسل دینے لگی، اور پھر بجائے آگے بڑھنے کے دو میل پیچھے ہٹ آئی۔ دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ میں اس کا سبب نہ سمجھ سکا۔ ٹرین میں ایک چھوٹا سا انجن

اور پانچ ڈبے تھے، جن میں زیادہ مسافر نہ تھے اور عموماً ان کی تعداد یہی رہا کرتی ہے۔ دراصل یہ ٹرین صرف مال کی باربرداری کے لئے جاری کی گئی ہے جس میں مسافر بھی سفر کر لیتے ہیں۔ میں گاڑی سے اُتر کر ڈرائیور کے پاس گیا، اور اُس سے گاڑی کے واپس آنے اور رُکنے کا سبب دریافت کیا، اُس نے جواب دیا کہ لائن پر سامنے دو جنگلی ہاتھی تھے، اِس لئے ٹرین کو واپس لانا پڑا، اگر ٹرین چلتی رہتی، تو یہ دونوں ہاتھی انجن کے سامنے آکر ٹکریں لگاتے، اور گاڑی کے ڈبّوں کو گرا دیتے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اِس لائن پر آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، یہاں تو قریب قریب روزانہ یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جنگلی ہاتھیوں کی بہتات ہے، اُن کے حملوں سے بچنے کے لئے گاڑی کو ہٹانا پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی پھر روانہ ہوئی۔ جب دوبارہ گاڑی اُس مقام پر پہنچی، تو دیکھا کہ کم بخت ایک ہاتھی لائن پر بیٹھا ہے۔ گاڑی پھر کچھ فاصلہ پر روک لی گئی اور ڈرائیور نے سیٹی پر سیٹی دینی شروع کی، اور انجن کا سٹیم چھوڑ کر ہاتھی کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی، مگر اُس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اُس نے اِدھر سر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا۔ آخر ڈرائیور کو مجبور ہو کر پھر گاڑی ایک میل واپس لے آنی پڑی۔ اگر گاڑی وہاں رُکی رہتی، تو ضدّی ہاتھی بھی بدستور لائن پر اپنی جگہ بیٹھا رہتا اور یا پھر اُٹھ کر ٹرین کا مقابلہ کرتا۔ گاڑی دیر تک کھڑی رہی۔ ۲ بج چکے

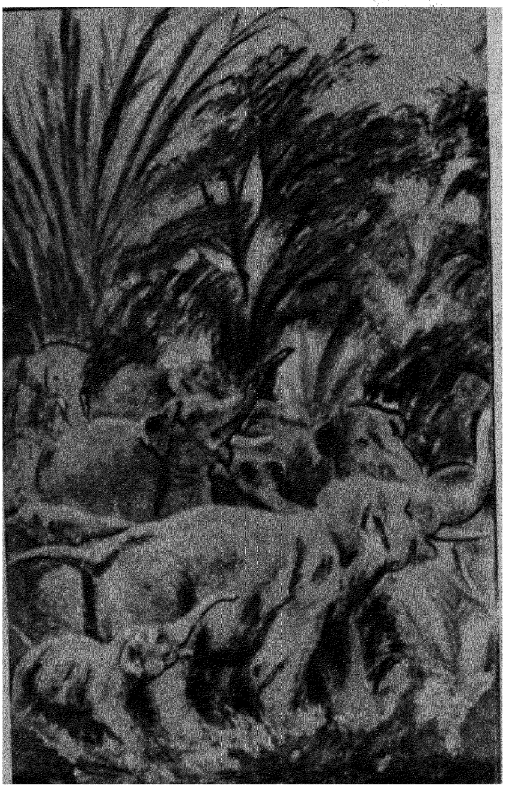

شمالي بورنيوي جنگلي هاٿي

تھے اور سفر ابھی تک کچھ بھی نہ طے ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض مرتبہ اِن ہاتھیوں کی بدولت دو دو تین تین دن گاڑی کی آمد و رفت بند رہتی ہے۔ ہاتھی اِس جنگل میں بکثرت ہیں، خصوصاً سیگاماں کے قریب تو یہ اور بھی بافراط ہیں۔

ٹرین اڑھائی بجے کے قریب پھر روانہ ہوئی۔ خوش قسمتی سے اب لائن صاف تھی۔ ہر دو جانب ہرے بھرے جنگل جاذبِ نظر تھے۔ پانی کے چشمے اور نالے کثرت سے جاری تھے۔ جنگلی جانوروں کے غول کے غول کلیلیں کرتے پھرتے تھے۔ اب ہم شمالی بورنیو کے مشہور اور بلند پہاڑ کینا بالو کے دامن سے گذر رہے تھے۔ اِن پہاڑوں میں بورنیو کا خاص جانور ٹیپیر بھی ملتا ہے جس کو دیکھنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔

ہم پانچ بجے شام کو بخیریت سیگاماں اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ منیجر صاحب کا بنگلہ دُور نہ تھا۔ جب ہم مع سامان پہنچے تو وہ ہم کو دیکھکر بہت مسرور ہوئے اور بنگلہ کے دو کمرے ہمارے حوالے کر دیئے۔ رات کا کھانا میں نے اُنھیں کے ساتھ کھایا۔ جب میں نے راستہ کے ہاتھیوں کا قصہ اُنھیں سُنایا، تو وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ یہاں تو یہ روزمرّہ کا قصہ ہے۔ اکثر قلی اور شکاری اِن کے ہاتھوں زخمی اور کام آتے رہتے ہیں۔ کھیتی اور فارموں کو آئے دِن تباہ و برباد کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے ہاتھیوں کو ہم نے گولی

سے مار دیا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی ہاتھی زخمی ہو کر بھاگ جاتا ہے، تو سارے علاقہ میں قیامت برپا کر دیتا ہے اور بہتیروں کی جانیں جاتی ہیں، اس لئے ہاتھیوں پر گولی چلانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ ہاتھی عموماً صرف شمالی بورنیو ہی میں پایا جاتا ہے اور حصّۂ ملک قریب قریب اس سے محفوظ ہیں۔

دوسرے روز عنایت نے کھانے اور ناشتے کا انتظام سٹوڈ پر کر لیا۔ دُودھ اور انڈے وغیرہ ہم کو مینیجر صاحب کے ہاں سے آجاتے تھے، شکار کے گوشت کی یہاں کوئی کمی نہ تھی۔

فارموں کے انگریز جتنے دُور و نزدیک کے تھے، وہ سب مینیجر صاحب کے بنگلہ پر آجاتے تھے، اس لئے مجھے اُن کے پاس جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ ایک ہفتہ میں پانچ چھ سو روپئے کے قریب کاروبار بھی کیا۔ میں یہاں ایک ہفتہ اور محض شکار کی غرض سے ٹھہر گیا۔ چھوٹے اور بڑے ہرن تو ہم آسانی سے روزانہ دو ایک حسبِ ضرورت شکار کر لیا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے پہاڑ کے دامن میں سانبھر کا شکار کیا۔ بنگلہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر دامنِ کوہ میں ہم ایک جھاڑی کے عقب میں بیٹھے تھے، میرے ساتھ عنایت اور ایک قلی تھا۔ ہمارے سامنے ذرا نشیب میں صاف و شفّاف پانی کی ندی بہ رہی تھی۔ دُھوپ کا

وقت تھا، اور خیال یہ تھا کہ شاید اِس وقت ٹیپر جنگل سے نکلکر ندی پر پانی پینے کے لئے سامنے آجائے تو اُس کے شکار کا یہ بہت اچھا موقع ہوگا۔ ہاتھیوں کا خوف بھی ہم کو تھا۔ جنگلی سوروں سے تو ہم بچ جاتے تھے اور وہ ہمارے قریب بھی نہ آتے تھے۔

تھوڑے عرصہ کے بعد پہاڑ کی بلندی سے کسی بڑے جانور کے اُترنے کی آہٹ سُنائی دی۔ پتھروں کے گرنے کی آواز سے معلوم ہوا کہ وہ اسی طرف کو آرہا ہے۔ خیال ہوا کہ غالباً یہ ٹیپر ہے۔ میرے ہاتھ میں رائفل تیار تھی۔ کچھ دیر کے بعد ندی کے کنارے جھاڑیوں میں بڑے بڑے سینگ دکھائی دیئے، جو نہایت ہی عمدہ سانبھر کے سینگ تھے۔ اُس کا جسم ہمارے سامنے نہیں تھا، جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ انداز سے میں نے اُس کے سینہ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی کھاتے ہی وہ ایک دفعہ اُچھلا اور بھاگا، پھر تھوڑی دُور جاکر گر گیا۔ اُس کے سینگ، چمڑا اور کچھ گوشت لیکر ہم واپس آگئے۔

منیجر صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ اِن جنگلوں میں جنگلی بیل نہیں ہے، وہ زیادہ تر سارا داک کے جنگلوں میں ملتا ہے۔ اُنھوں نے یہ کہا کہ آپ کل صبح یہاں سے دو قلی ساتھ لیکر اس سامنے والے پہاڑ کی بائیں جانب بلند چوٹی کو طے کر کے اُس پار چلے جائیں، اصل شکار

آپ کو وہاں ملے گا۔ اُس جنگل میں سانبھر، ہرن تو بے حساب ہیں، اور ممکن ہے کہ شیر اور سیاہ رنگ کا چیتا دن کے وقت دکھائی دے ٹیپر بھی ملے گا، اور ریچھ تو بڑی کثرت سے ملیں گے۔ شام تک آپ واپس آجائیں۔ ایسی دلچسپ خبر سُنکر میں کیسے باز رہ سکتا تھا۔

دوسرے روز صبح ہی میں اور عنایت دو قلیوں کو جو راستوں سے واقف تھے، ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ عنایت نے ایک ٹوکری میں ناشتہ اور کھانا بند کر کے ایک قلی کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے پیٹی میں رائفل کے کارتوس کافی لگا لئے۔ رائفل عنایت کے کندھے پر تھی۔ وہ اور دونوں قلی تھوڑے فاصلہ پر میرے پیچھے آرہے تھے، تین چار میل کے فاصلہ پر بلند پہاڑ ہمارے سامنے تھے۔ کوہ کینا بالو سے قدرتی ندی، نالے بہت سے جاری تھے۔ پہاڑ کی بلندیوں سے آبشار گر رہے تھے، جس سے اطراف و اکناف کے تمام جنگل گنجان اور گھنے ہونے کے علاوہ نہایت ہی سرسبز و شاداب تھے۔ رنگ برنگ کے قدرتی پھولوں کے تختے دور تک چلے گئے تھے۔ اُن کی کثرت کا یہ عالم تھا، کہ گویا زمین نے کمال سخاوت سے اپنے اندر کا سارا خزانہ اسی مرغزار میں اُگل کر رکھدیا ہے۔ غرض منظر کی لطافت ایک عالم محویت پیدا کر رہی تھی

ہم ایک ندی کے کنارے پہنچے۔ عنایت نے کہا کہ یہاں ٹھہر کر ناشتہ

کرلیا جائے، لیکن میں اِن دلفریب مناظر میں اس قدر محو تھا، کہ مجھے ناشتے اور کھانے کی پروا نہ تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ ابھی کچھ اور آگے چلکر ناشتہ کریں گے۔

اب ہم گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے، ہمارے سامنے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ دُور جانے کے بعد ایک چھوٹی سی ندی پھر ہمارے سامنے آگئی۔ یہاں میں اِس ارادہ سے رُک گیا کہ ٹھہر کر ناشتہ سے فراغت حاصل کرلی جائے۔ عنایت اور قلی تھوڑے فاصلہ پر آرہے تھے۔ تقریباً صبح کے ۸ بج چکے تھے۔ جنگل میں بندر اور ہرن ہر طرف بھاگ دوڑ اور اُچھل کود مچائے ہوئے تھے۔ میں ابھی وہاں رُکا ہی تھا کہ قریب کی جھاڑیوں میں سے کچھ سرسراہٹ سُنائی دی۔ اِس کے بعد ہی فوراً ایک جنگلی ہاتھی چنگھاڑتا ہوا نکلکر میری جانب لپکا۔ عنایت اور قلی جو قریب آچکے تھے، ہاتھی کو دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں جان لے کر بھاگے۔ میں بالکل ہاتھی کے سامنے تھا اور بھاگ کر اُس سے بچ سکتا تھا۔ فوراً قریب کے درخت پر جست کرکے چڑھ گیا اور اُس کے حملے سے بچگیا۔ اُس کا قد چھوٹا تھا۔ مجھے زیادہ بلندی پر جانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ میں درخت کے ایک دو شاخے کے درمیان بیٹھ گیا۔ وہ درخت کے اِرد گرد غصّہ سے بے چین پھرتا رہا۔ کبھی درخت میں ٹکریں مارتا،

کبھی سونڈ سے کھینچ لینے کی کوشش کرتا اور کبھی غصّہ میں جھلّا کر چنگھاڑتا۔ عنایت اور قلّی دُور جاکر درخت پر چڑھ گئے تھے۔ میری رائفل عنایت کے پاس تھی اور رائفل کے کارتوس میرے پاس تھے۔ یہ ہاتھی پستہ قد، سیاہ رنگ کا تھا، اور ایک ایک فیٹ کے لمبے دانت تھے۔ جب ہاتھی نے آدھ گھنٹہ تک درخت کو گرانے کی اپنی ساری کوشش ختم کرلی، اور درخت نہ گرا، تو سُرخ سُرخ غضبناک آنکھوں سے کھڑا ہوکر مجھے گھورنے لگا۔ وہ اُوپر کو مُنھ اُٹھائے مجھے دیکھ رہا تھا، (اس وقت اُس کی صورت سے صاف مُترشح تھا کہ گویا وہ غصّہ میں زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ ذرا نیچے اُتر آؤ تو دیکھو کہ تمھاری کیسی مرمّت کی جاتی ہے۔ اِدھر میں بھی دل ہی دل میں ان الفاظ میں اُس کا جواب دے رہا تھا کہ کاش! اس وقت میری رائفل میرے ہاتھ میں ہوتی تو وہی گولیوں میں یہیں ڈھیر کر دیتا۔) تھوڑی دیر کے بعد کم بخت درخت کی جڑ کے ساتھ کمر لگاکر بیٹھ گیا اور کامل ایک گھنٹہ اسی طرح بیٹھا ہوا جمائیاں لیتا اور اُوپر کو دیکھتا رہا۔ جب وہ تھک گیا تو اپنے سامنے والے دونوں پاؤں پھیلاکر اور اپنا سر اُن پر رکھ کر بڑے اطمینان سے سوگیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ وہ عاجز آگیا ہے، اب جلد ہی یہاں سے ہٹ جائے گا، مگر وہ نہ ہٹا، حتیٰ کہ مجھے اسی حال

جنگلي ہاتھي کا حملہ

میں کامل چار پانچ گھنٹے گذر گئے۔ دوپہر ہوگئی، ۱۲ بجگئے۔ صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک سے بے چین تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ عنایت اور قلی میرے قریب ہیں یا سیگاماں واپس چلے گئے ہیں۔ اب میں کروں تو کیا کروں..... نہایت پریشان تھا۔ درخت سے اُتر بھی نہیں سکتا تھا، نہ رائفل ہی میرے پاس تھی۔ اب جوں جوں وقت گذر رہا تھا، پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اگر میرے پاس رائفل ہوتی، تو میں گولیوں سے اُس کا کام تمام کر دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا، اگرچہ اس میں اس امر کا اندیشہ تھا، کہ اگر یہ زخمی ہو کر کہیں قریب ہی جا چھپا تو میرے درخت سے اُترتے ہی یہ مجھ پر حملہ کر دے گا، اور اُس وقت مجھے اپنی جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ اسی فکر و تردد میں ۲ بجگئے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب یہ کم بخت یہاں سے نہ ہٹے گا، خواہ اسی حال میں ایک ہفتہ گذر جائے۔ ہاتھی کی ضد مشہور ہے۔ مجھے تو یہ شک ہو رہا تھا کہ دراصل یہ سو نہیں رہا ہے، بلکہ مجھے دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ اپنی سونڈ کو کبھی اپنے سر پر اور کبھی اپنے سامنے زمین پر رکھ لیتا تھا، اور کبھی لمبی لمبی سانس لیتا تھا۔

تین بجے کے قریب جب میں زیادہ پریشان ہو گیا اور تنگ آگیا، شام بھی قریب ہوتی جا رہی تھی، تو یکایک مجھے اس بلائے بے درماں سے

رہائی کی ایک ترکیب سوجھی۔ میری برجس کے جیب میں سگار بکس کے ساتھ ماچس پڑی تھی۔ اِس وقت اِس ماچس کی ڈبیا نے میری بہت بڑی خدمت انجام دی اور میری جان بچالی۔ میں نے درخت سے آہستہ آہستہ سوکھی اور پتلی لکڑیاں توڑ کر ان کا ایک بنڈل سا بنایا۔ جیب سے رومال نکالا، اُس کو پھاڑ کر پانچ چھ گز لمبی رسّی بنائی۔ اِس رسّی کا ایک سرا بنڈل کے درمیانی حصّہ میں مضبوطی سے باندھ دیا، کچھ ماچس کی تیلیاں اور بچا ہوا رومال کا ٹکڑا لکڑیوں کے ایک سرے میں ٹھونس دیا، تاکہ لکڑیاں آسانی سے آگ پکڑ لیں۔

جب یہ سب سامان تیار ہوگیا، تو میں نے ماچس جلا کر رومال کے ٹکڑے میں آگ لگادی، اور لکڑیاں جلنے لگیں۔ میں نے یہ احتیاط کرتے ہوئے کہ رسّی میں آگ نہ لگ جائے، جلدی سے اُس کو نیچے لٹکا کر سوتے ہوئے ہاتھی کی کمر پر رکھ دیا۔ اُس کے رکھتے ہی ہاتھی ایکدم سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا، اور چیختا ہوا ایسا بھاگا، کہ اُس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور میلوں دُور نکل گیا۔ میرے جان میں جان آئی۔

اب میں درخت سے نیچے اُترا، اور سیگاماں کی جانب تیز قدمی سے روانہ ہوگیا۔ جب میں فارم کے قریب پہنچا، تو دیکھا کہ عنایت اور پندرہ بیس قُلی اِس طرف دوڑتے چلے آرہے ہیں۔ سب کو میں واپس لے گیا۔

منیجر صاحب سے کُل واقعہ بیان کیا، اُن کو افسوس ہوا، اور آخری تماشے پر وہ ہنس دیئے، کہ وقت پر آپ کو خوب سُوجھی - ہاتھیوں کے خوف سے مجھے دوبارہ جنگل میں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

دوسرے روز یہاں سے روانگی کا ارادہ کرلیا۔ دوسری صبح کو ۱۱ بجے ریلوے سٹیشن سے معلوم ہوا کہ آج گاڑی یہاں سے نہ روانہ ہوگی، اس لئے کہ لائن پر ہاتھیوں کا غول موجود ہے - ریلوے لائن کے اِس حصہ پر ہمیشہ یہی حال تھا - ۱۲ بجے کے قریب روزانہ یہاں سے گاڑی روانہ ہوتی تھی بشرطیکہ لائن صاف ہو، ورنہ کئی کئی روز تک گاڑی بند رہتی تھی - ہاتھی اکثر ٹرین کو نقصان پہنچا جاتے تھے - مجبوراً آج ہم کو یہاں رُکنا پڑا۔

باب تیسرا

بحری چلینی ڈاکو

آج سنیچر کا دن تھا، ہاتھیوں کے خوف کی وجہ سے گاڑی سیدگاماں سے نہ روانہ ہوسکی تھی، مگر شام کو ۴ بجے کے قریب لاحد ڈانو سے گاڑی یہاں پہنچگئی۔ ڈاکٹر جونز ایک اسٹریلین نوجوان گاڑی سے اُتر کر مع اپنے شکاری سامان کے مینیجر صاحب کے بنگلہ پر پہنچے، اور اُن کے مہمان ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نہایت قد آور، وجیہ نوجوان تھے، اور بہت اچھے شکاری تھے۔

جب مینیجر صاحب نے اُن سے میرا تعارف کرایا، تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک روز اور ٹھہر جانے پر مجبور کیا۔ وہ یہاں محض شکار کی غرض سے آئے تھے۔ اِس جنگل کے شکار سے بخوبی واقف تھے اور ہاتھیوں سے بھی خوب نپٹ لیتے تھے۔ شکار کی تیاری شروع کی گئی، بوس بارہ قلیوں کا انتظام کیا گیا۔ کچھ مشعلیں تیار کی گئیں۔ دن کے وقت بھی ہاتھیوں سے بچنے کا یہ اچھا انتظام تھا۔ ہاتھی صرف آگ ہی سے خوف کھاتا اور جان

لیکر بھاگتا ہے۔

دوسرے روز صبح ہی ہماری یہ پارٹی جنگل کو روانہ ہوگئی۔ میرے ساتھ عنایت بھی تھا، مگر اس مرتبہ رائفل کو میں نے اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر جونز کے پاس بڑی دونالی رائفل تھی۔ ہم سب تیز قدمی سے جا رہے تھے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا، اور ہم گھنے جنگل میں پہنچ گئے تھے۔ کسی قدر آگے بڑھنے کے بعد ہاتھیوں کے چنگھاڑنے اور شور مچانے کی آواز سنائی دی۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے وہاں رُک گئے۔ معلوم ہوا کہ سامنے جنگل میں بہت سے ہاتھی موجود ہیں۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ذرا بائیں طرف ہٹ کر ہم آگے روانہ ہوگئے۔ اب ہمارے سامنے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی تھی۔ راستہ آہستہ آہستہ طے ہو رہا تھا۔ یہ پہاڑ کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ ایک گھنٹہ میں ہم اس کو عبور کر کے دوسری طرف جنگل میں پہنچ گئے تھے۔ اس طرف نشیب میں گھنا جنگل تھا۔ وہاں بعض جگہ نرم زمین پر بہت سے جانوروں کے پاؤں کے نشانات تھے۔ ہاتھیوں کے پیروں کے نشان جا بجا تھے۔ ایک دوسرا نشان مجھے ڈاکٹر صاحب نے دکھایا، جو گینڈے کے پاؤں سے بہت کچھ مشابہ تھا۔ یہ نشان ٹیپر کے پاؤں کے تھے۔ ایک بڑے چشمہ کے کنارے ہم نے ناشتہ کیا، اور اسی چشمہ کے قریب درختوں پر جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ایک مضبوط درخت پر میں رائفل لے کر بیٹھ گیا، اور اسی طرح

تھوڑے فاصلہ پر ڈاکٹر صاحب بھی ایک درخت پر بیٹھ گئے۔ عنایت کو میں نے اپنے قریب بٹھالیا۔ باقی قلیوں کو تھوڑے فاصلہ پر خاموشی سے بٹھا کر اُن کو ہدایت کردی، کہ اگر سامنے ہاتھی آجائیں تو مشعلیں جلا کر اُن کو بھگا دینے کی کوشش کریں۔

صبح آٹھ بج چکے تھے، جنگل میں خاموشی طاری تھی۔ میرے سامنے پانی کا چشمہ، اور گھنا جنگل تھا۔ پُشت کی جانب پہاڑی تھی، جس کو ہم ابھی ابھی عبور کرکے آئے تھے۔ دُور سے رہ رہ کر ہاتھیوں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ بندر درختوں پر اِدھر سے اُدھر کُودتے پھر رہے تھے۔ کبھی کبھی سؤر بھی بھاگتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ اِس وقت ہمارے مدِنظر ٹیپر، شیر، چیتا اور ساانبھر کا شکار تھا۔ شیر یا چیتے کی تو دن کے وقت ملنے کی اُمید کم تھی، البتہ ٹیپر یا ساانبھر کے ملنے کا یقین تھا۔ ریچھ کے نکل آنے کی بھی توقع تھی، اس لئے کہ اس جنگل میں اِن کی کمی نہ تھی، لیکن مجھے اِس وقت زیادہ تر صرف ٹیپر ہی کے شکار کا خیال تھا اور جو میرے لئے اپنی نوعیت کا ایک نیا شکار تھا۔

۱۰ بجے کے قریب ڈاکٹر جونز نے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ کچھ فاصلہ ہونے کی وجہ سے معلوم نہ ہوسکا، کہ کس جانور پر فائر ہوئے ہیں۔ اِس کے بعد پھر خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ تیسرا فائر ہوا، جس کے ساتھ ہی ساانبھر

کی چلّانے کی آواز آئی ۔ دُو منٹ کے بعد پھر فائر ہوا ۔ اُس کے بعد خاموشی ہوگئی ۔

آدھ گھنٹہ گذر جانے کے بعد ایک بھالو میرے سامنے آگیا ۔ وہ آہستہ آہستہ جارہا تھا ۔ وہ ہندوستان کے بھالوؤں سے بہت خوبصورت ، چھوٹے قد اور سیاہ رنگ کا تھا ۔ گردن کے نیچے ایک سفید دھاری تھی ۔ وہ میرے سامنے سے گذر گیا ، میں نے اُس پر فائر نہیں کیا ۔ اس کے تھوڑے ہی وقفہ کے بعد تین ٹیپر میری پُشت کی جانب سے پہاڑ پر سے اُترے ، اور بہت آہستہ آہستہ میرے قریب سے گذرے ۔ ان کی عجیب شکلیں تھیں ۔ جوں ہی وہ میری زد میں پہنچے ، میں نے اُن میں سے نر پر دُو فائر کیے ۔ ایک گولی سینہ پر اور دوسری گردن پر لگی ۔ وہ زخمی ہو کر وزا رُکا ۔ میں نے دُو فائر اور کیے ۔ وہ قریب ہی گر گیا ۔ باقی دونوں جانور بھاگ گئے ۔ مجھے اس ایک نئے جانور کے شکار سے بڑی مسرت حاصل ہوئی ۔ بھالو ، شیر ، چیتا اور سانبھر وغیرہ میرے لیے کوئی نئے شکار نہ تھے ۔

ٹیپر بورنیو کے علاوہ ملایا کے بعض حصّوں میں بھی ملتا ہے ۔ یہ گینڈے کی شکل کا بھاری بھرکم جانور ہے ، لیکن اس کا مُنھ لمبا اور پتلا ہوتا ہے ۔ دانت تیز اور کان چھوٹے ہوتے ہیں ۔ اِس کا سارا جسم سیاہ اور کمر کا حصّہ سفید ہے ۔ دُور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی نے کمر پر سفید چادر

ڈال دی ہے۔ دُنیا میں جو عجیب و غریب مختلف قسم کے جانور پائے جاتے ہیں، اُنھیں میں اِس کا شمار بھی ہے۔ برازیل (جنوبی امریکہ) میں بھی یہ پایا جاتا ہے۔ اِس کا چمڑا موٹا ہونے کی وجہ سے گولی کے اثر کو مُشکل سے قبول کرتا ہے۔ یہ گوشت خور جانور نہیں ہے، بلکہ گھاس، درختوں کے پتّے اور پھل اِسکی خوراک ہے۔

اب ۱۲ بج چُکے تھے، بُھوک معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی، کہ ڈاکٹر جونز نے سیٹی دی۔ قُلی اُن کے پاس پہنچگئے، وہ درخت سے اُتر آئے، ہم بھی اُتر کر اُن کے پاس گئے۔ وہاں جاکر دیکھا، تو دو بھالو اور ایک سانبھر اُنھوں نے مارے تھے۔ یہ سُنکر اُنھیں خوشی ہوئی کہ میں نے ٹیپیر شکار کیا ہے۔

چشمہ پر بیٹھکر ہم نے کھانا کھایا۔ اِس کے بعد قُلیوں نے جانوروں کی کھالیں اُتارنے میں کچھ وقت گذار دیا۔ ۳ بجے کے قریب ہم وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔ پہاڑ کو طے کرکے جب ہم دوسری طرف جنگل میں آئے تو ہم کو ہاتھیوں کے حملے کا شُبہہ ہوا، جو ہم سے قریب ہی تھے مشعلیں فوراً جلادی گئیں، اور ہم چلتے رہے۔ مشعلوں کے باعث ہاتھی ہمارے قریب نہ آئے۔ اِس جنگل میں ہاتھیوں سے بچنے کے لئے یہ عمدہ ترکیب تھی۔ جنگل کے باہر پہنچکر مشعلیں بُجھادی گئیں۔ شام کو بنگلہ پر پہنچے۔ دوسرے

روز ڈاکٹر جونز کے ساتھ ہی ہم نے بھی لاحد ڈاٹو تک گاڑی میں سفر کیا۔ وہاں ایک روز اُن کے مہمان رہے، اور پوسٹ آفس کے ذریعے پانچ سو روپے میں نے چارٹرڈ بنک سنڈیکن کے نام اپنے حساب میں بھیجدیئے۔ دوسرے دِن کشتی کے ذریعے ہم ٹیواڈ آئے۔ وہاں سے دوسری کشتی کا انتظام کر کے کڈت پہنچے۔ وہاں سے دوسرے روز ہم بڑی کشتی کے ذریعے سینا و تنبا کو سٹیٹ میں گئے۔ یہاں انگریزوں کی خوب آبادی ہے۔ ہم کو ایک موقع کا مکان کرایہ پر مِل گیا، جو صاف و ستھرا تھا۔ ایک ہفتہ ہم نے یہاں قیام کیا۔ پانچسو روپے سے زائد مال فروخت ہوا، اور شکار بھی ہوتا رہا۔ چھوٹے ہرن (مئوس ڈیئر) شکار ہوئے۔ اِس کے بعد ہم کڈت واپس آئے۔ وہاں سے ہم سٹیمر کے ذریعہ جیسلٹان ہوتے ہوئے لابون پہنچے۔ یہ تینوں بندرگاہ سٹیمر کی لائن پر ہیں۔

لابون سے سٹیمر سنگاپور، سنڈیکن، میسیری اور سارا واک کو آتے جاتے ہیں۔ لابون میں ہم دو روز ٹھہرے۔ یہاں سے میں نے تھوڑا سا مال دے کر عنایت کو سنڈیکن واپس بھیجدیا، تاکہ میری واپسی تک وہاں بیکار نہ رہے کچھ کاروبار کرتا رہے، جس سے اب وہ کسی قدر واقف ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی رائفل اور شکار کا سامان بھی اُس کے ساتھ بھیجدیا، اس لئے کہ میرا پروگرام اب یہ تھا، کہ لابون سے میں میسیری جاؤں اور وہاں بقیہ مال

فروخت ہوجانے پر میں پھر لابون ہوتا ہوا نئے مال کے لئے سنگاپور چلا جاؤں۔ وہاں سے سنڈیکن واپس جاؤں۔

عنایت کو سنڈیکن روانہ کرنے کے بعد، میں لابون سے ایک کشتی کے ذریعہ میسیری کو روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچکر ایک امریکن ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ یہ میسیری سمندر کے کنارے ڈیچ سارا واک کے علاقہ میں واقع ہے۔ یہاں پیٹرول کی زبردست کانیں ہیں۔ ہزاروں امریکن اور کنیڈین کام کرتے ہیں۔ میلوں میں دُور تک یہ کارخانے پھیلے ہوئے ہیں۔ زمین سے مشینوں کے ذریعہ پیٹرول نکالا جاتا ہے، اور دوسرے مُلکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ اِن کارخانوں کا انتظام سارا واک اوئل فیلڈ کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں کاروبار میری اُمید سے زیادہ اچھا رہا۔ دس بارہ روز میں ایک ہزار روپئے کے قریب میرے پاس نقد آگئے۔ پانچ سو روپئے میرے پاس پہلے موجود تھے، جو سناؤ تمبا کو سٹیٹ سے وصول ہوئے تھے۔ اس طرح کل پندرہ سو روپئے نقد اس وقت میرے پاس موجود تھے۔ اِن کے علاوہ میں پانچسو روپئے بنک کو بھیج چکا تھا، کچھ تھوڑا سا مال بھی بچ گیا تھا اب میں نئے مال کے لئے سنگاپور جانے کو تیار تھا۔ میسیری سے لابون اور سنگاپور تک سٹیمر جاتے تھے۔ مگر سٹیمر کے آنے میں ابھی ایک ہفتہ دیر تھی۔ بادبانی جہاز اکثر مال لے کر لابون آتے جاتے تھے۔

میں نے لابون تک بادبانی جہاز میں سفر کا ارادہ کرلیا۔ لابون سے سٹیمر جلد ملجانے کی اُمید تھی۔

دوسرے روز صبح میں میسیری سے روانہ ہوگیا۔ اِس جہاز میں میرے علاوہ چار اَمریکن ایک لیڈی اور دو بچے بھی سوار تھے، اور ایک درجن سے زائد پیٹرول کے کارخانوں کے ملائی قلی مسافر بھی سوار تھے۔ یہ امریکن اور قلی سب اپنے اپنے وطن واپس جارہے تھے۔ اِن سب کے پاس نقد روپیہ اور سامان تھا۔ لابون، میسیری سے اِس جہاز کے ذریعہ دو روز کا سفر تھا۔

شیانگ ڈاکو

اُن دنوں اِن تمام سمندروں میں ایک چینی بحری ڈاکو شیانگ کی بڑی دُھوم تھی، جو ایک بڑا خونخوار بحری ڈاکو تھا۔ اپنے گروہ کے ساتھ یہ جہازوں اور مسافروں کو ہمیشہ لُوٹتا مارتا رہتا تھا۔ سخت بے رحم تھا۔ قتل و غارت گری اِس کا روزانہ کا ایک معمولی اور ادنیٰ کام تھا۔ اِس کے خوفناک قصّے میں نے لابوا اور سنڈیکن اور میسیری میں بہت سُنے تھے۔ اِس کے جاسوس ہر جگہ موجود رہتے تھے۔ برٹش اور ڈچ گورنمنٹ نے بارہا اِس کو اور اِس کے گروہ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، اکثر

مُقابلے ہوئے، مگر یہ کبھی قابو میں نہ آئے۔ اِن کے خوف وہراس سے بادبانی جہازوں کی آمدورفت بہت کم ہوگئی تھی۔

بدقسمتی سے ہمارا جہاز بھی اِن کی نظر سے نہ بچ سکا۔ اِن کے جاسوس ہمیشہ اِن کو ایسے جہازوں کی روانگی کی اطلاع دیتے رہتے تھے، جن میں مال اور نقد موجود ہو۔ میسیری سے جہاز روانہ ہونے کے بعد ایک دن اور رات تو خیریت سے گذر گئی۔ دوسرے دن صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی جہاز کے ملّاحوں اور ملائی قلیوں میں ایک شور اور ہنگامہ برپا ہوگیا۔ میں اپنے بستر ہی پر تھا، کہ اِس غیر معمولی شور سے متاثر ہوکر میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اِس کا سبب دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ شیانگ ڈاکو ہمارے جہاز کے تعاقب میں آرہا ہے۔ اَمریکن بھی سب جاگ اُٹھے اور اِس خبر کے سُنتے ہی سب کے ہوش و حواس جاتے رہے، اور سب کے سب ڈر اور خوف سے سہم گئے۔ اپنی موت کا سب کو یقین ہوگیا کیونکہ یہ ظالم قتل و غارتگری میں ذرا تامّل نہ کرتے تھے۔

ہم نے دیکھا، کہ وہ جہاز بڑی تیزی سے ہمارے تعاقب میں چلے آرہے ہیں۔ یہاں مُقابلے کی طاقت کس میں تھی؟ ہم سب بے بس تھے۔ خاموشی سے سب بستروں پر لیٹ گئے۔ اِس وقت ہماری عجیب حالت تھی۔ موت کے خوف سے سب کے دل دھڑک رہے تھے

دُور و نزدیک کوئی شخص بھی ایسا نظر نہ آتا تھا، جو ہماری مدد کو پہنچتا۔ ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ ڈاکو ضرور ہم سب کو قتل کر دیں گے یا سمندر میں پھینک دیں گے۔

سمندر کی سطح پر جوں ہی سورج طلوع ہوا، وہ ہم سے بہت نزدیک پہنچ گئے، اور یکایک اُنھوں نے ہمارے جہاز پر فائر کرنے شروع کر دیئے۔ ملاحوں نے جہاز کو روک لیا، اور بادبان اُتار دیئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جہاز والوں نے جان کی امان کے لئے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ جہاز کے رُکتے ہی فائر بند ہو گئے۔ پندرہ منٹ نہ گذرے تھے کہ اُن کے جہاز ہمارے جہاز کے ساتھ آ لگے۔ خونخوار بھیڑیوں کا ایک گروہ مع شیانگ ڈاکو کے ہمارے جہاز میں آ کودا، اور بندوقوں کے کُندوں سے ہم سب کو مارنا شروع کر دیا۔ ملاحی قلیوں اور بچّوں نے رونا اور چیخنا شروع کیا، ایک حشر برپا ہو گیا۔ میرے کندھے اور سر پر شدید چوٹیں آئیں۔ ہاتھوں پر بھی ضرب آئی۔ سر کے زخم سے خون بہنے لگا۔ آخر میں نے اور امریکیوں نے اپنی جان بخشی کے لئے، اپنے اپنے ہاتھ اُوپر کو اُٹھا دیئے، جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم بے بس ہیں، آپ جو چاہیں کریں ہم مُخل نہ ہوں گے۔

اب اُنھوں نے ہماری طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر سامان کو لُوٹنا شروع

کردیا۔ ہم اسی طرح ہاتھ اُٹھائے ہوئے ایک طرف کھڑے رہے۔ ہمارا سامان اُٹھا اُٹھا کر انھوں نے اپنے جہازوں میں پھینکنا شروع کیا۔ امریکنوں کا سب سامان اُٹھا کر لے گئے۔ میرا ٹرنک جس میں علاوہ مال کے پندرہ سو روپے نقد سے زائد تھا، میری آنکھوں کے سامنے اُٹھا کر لے گئے۔ میرے سوٹ، بوٹ، دیگر کپڑے و سامان، بیٹ اور بستر حتیٰ کہ کھانے وغیرہ کی ٹوکری بھی لے گئے۔ ایک چیز بھی نہ چھوڑی۔ میری کلائی پر رسٹ واچ لگی ہوئی تھی، وہ بھی اُتار لی گئی۔ اب میرے پاس صرف قمیص، پاجامہ اور پاؤں میں سلیپر تھے، اور کچھ باقی نہ چھوڑا تھا خیر۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ یہ اُن کی ہمارے حال پر خاص مہربانی ہوئی کہ کسی کی جان نہیں لی گئی۔ جہاز والوں کی چاول کی بوریاں بھی اُٹھا کر لے گئے۔ جب ہماری جامہ تلاشی لی گئی تو امریکنوں کے جیبوں سے کچھ نقدی اور نوٹ نکلے، جو چھین لئے گئے۔

یہ ہولناک فلم آدھ گھنٹہ تک ہمارے سامنے چلتا رہا۔ اس لوٹ مار کے بعد وہ سب رفو چکر ہو گئے۔ میرے سر کے زخم میں بہت تکلیف تھی خون ابھی تک جاری تھا۔ قمیص، پاجامہ سب خون سے خراب ہو گئے تھے۔ میں جہاز کے ایک تختہ پر لیٹ گیا۔ زخمی سب تھے، اور سب تکلیف میں مبتلا تھے۔ مار پیٹ سے کوئی نہ بچا تھا۔

اِس لُٹے ہوئے اور زخمی قافلہ کو لے کر جہاز پھر روانہ ہوا۔ ہم میں سے کسی کے پاس کھانے کو کچھ باقی نہ تھا۔ دوپہر کے بعد سب پر بھوک کا غلبہ تھا۔ سب نڈھال پڑے تھے۔ بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔ اسی طرح مصیبت اور تکلیف میں گرفتار غروب آفتاب کے قریب ہم لابون بندرگاہ پر پہنچے۔ وہاں پولیس میں ہمارے بیانات ہوئے پھر میں پنجابی سپاہیوں کی بارکوں میں چلا گیا۔ میں پہلے بھی اُن کا مہمان رہ چکا تھا۔ مجھے اِس حال میں دیکھکر اُنھیں صدمہ ہوا۔ فوراً ڈاکٹر کو بُلا لائے۔ میرے سر کے زخم کو صاف کر کے باندھ دیا گیا۔ دوا پلائی گئی۔ دن بھر کا بھوکا تھا، کچھ کھانا بھی کھایا۔ رات درد کی وجہ سے بڑی بے چینی سے گذری۔ دوسرے دن زخم کا پھر ڈریسنگ ہوا۔

میرا سنگاپور کا جانا ملتوی ہو گیا، اور اب میں سنڈیکن جانے کیلئے تیار تھا۔ سٹیمر کے آنے میں ابھی تین روز باقی تھے۔ یہ لوگ برابر میری خدمت کرتے رہے۔ میری حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ سٹیمر کے آنے پر میں نے کچھ روپیہ ان لوگوں سے قرض لیا، اور سنڈیکن روانہ ہو گیا۔ چوتھے روز سنڈیکن پہنچ گیا۔ دو ہفتے بستر پر پڑا رہا۔ گھر سے خیریت کے خطوط آئے ہوئے تھے اُنکے جوابات لکھے۔

جب میری صحت درست ہو گئی، تو میں نے بنک سے اپنے پانچ سو روپئے وصول کئے، کچھ روپیہ عنایت نے جمع کر رکھے تھے، وہ سب لے کر

میں مال لینے کے لئے سنگاپور روانہ ہوگیا اور بیس روز کے بعد سنڈیکن واپس آگیا۔

میسیری سے جہاز پر سوار ہونے سے ایک روز قبل میں شام کو ہوٹل میں قہوہ پی رہا تھا۔ ایک چینی نوجوان سوٹ، بوٹ پہنے اُسی میز پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اُس سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اُس کے دریافت کرنے پر میں نے اُس سے یہ کہا تھا کہ کل صبح میں یہاں سے فلاں جہاز کے ذریعہ لابون، جارہا ہوں، اور وہاں سے مال کی خریداری کے لئے سنگاپور جاؤں گا۔ اُس سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ اُسی جہاز پر چند امریکن بھی سفر کریں گے جو اپنے وطن واپس جارہے ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ شیانگ ڈاکو کا جاسوس تھا، اور اُسی نے ہمارے جہاز کی روانگی کی اطلاع اُس کو دی تھی۔

جب میں سنڈیکن سے تندرست ہوکر مال کی خریداری کے لئے سنگاپور جارہا تھا، تو راستہ میں مجھے لابون پہنچکر یہ خبر معلوم ہوئی تھی کہ شیانگ ڈاکو اور اُس کی گروہ کے کچھ لوگ گرفتار ہوگئے ہیں۔ ہمارے جہاز کی لوٹ مار کے بعد اِسی سمندر میں ایک بڑے جہاز پر ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا، جس میں کچھ لوگ مارے بھی گئے تھے۔ اِس کے فوراً بعد ریاست سارواک اور ریاست برونی کی مشترکہ فوجوں نے سمندر کے اندر اُن کا مقابلہ کیا۔ دونوں طرف کے

بہت سے آدمی مارے گئے، اور زخمی ہوئے۔ آخر شیانگ زخمی ہوکر مع اپنے چند ساتھیوں کے گرفتار ہوگیا۔ باقی ڈاکو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ چونکہ ان کی گرفتاری برونی کے علاقہ کے سمندر میں ہوئی تھی، اس لئے ان سب کو سلطان برونی کے حوالے کر دیا گیا

شیانگ بڑا دیرینہ ڈاکو تھا۔ تمام بورنیو۔ جاوا اور سماٹرا کے سمندروں میں عام لوگوں کے دلوں پر اس کی دھاک تھی۔ اس کی دہشت عام تھی، اس کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ جب میں سنگاپور پہنچا تھا، تو وہاں مقامی انگریزی اخباروں میں اس کی گرفتاری کی خبریں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ میں نے دیکھی تھیں۔ ایک انگریزی اخبار میں ہمارے جہاز کا بھی ذکر تھا کہ فلاں تاریخ کو اس نے لابون کے قریب ایک جہاز کو لوٹا، اور مسافروں کو زخمی کیا، جس میں ایک ہندوستانی تاجر اور چند میسیری کمپنی کے امریکن اور کچھ مقامی لوگ تھے۔ یہی تاریخ جہاز کی تباہی کی تھی۔

ان کی گرفتاری کی خبر سے بورنیو کے تمام سمندری علاقہ میں ایک خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کو بڑی طمانیت حاصل ہوگئی۔ لوگ بے خدشہ سفر کرنے لگے۔ گذشتہ تین مہینے میں میں نے جو کچھ کمایا تھا، وہ سب ان ڈاکوؤں کی نذر ہو چکا تھا۔ اب میں

نے از سرِ نو کمر ہمّت باندھی، مالِ تجارت بکسوں میں درست کرکے مع عنایت کے میں بذریعہ سٹیمر لابون پہنچا۔ وہاں ایک روز ٹھہرا، جن لوگوں نے لابون میں میری خدمت کی تھی، میرے سر کے زخم کا علاج کرلیا تھا، میں نے چند چیزیں اُن لوگوں کی نذر کیں، جو میں خاص طور پر اُن کے لیے سنگاپور سے لایا تھا۔

باب چوتھا

ڈاکوؤں کی موت

میں میری ٹوچ سارا واک میں پہلی مرتبہ میں فائدہ اُٹھا چکا تھا، اس لیۓ مال لے کر دوبارہ وہاں جانا چاہتا تھا۔ مگر ریاست برونی میں سشیانگ ڈاکو اور اُس کے ساتھیوں کا مقدمہ سلطان کے روبرو پیش تھا، اور اُس کا چرچا عام طور پر ہر جگہ تھا۔ دُور دُور سے لوگ اُس مقدمے کے حالات سُننے اور نتیجہ کو دیکھنے کے لیۓ برونی جارہے

تھے، مجھے بھی یہ شوق برونی لے گیا۔ برونی سے میسیری دُور نہ تھا۔ خیال ہوا کہ چند روز کے بعد وہاں سے میسیری چلا جاؤں گا۔ ایک جہاز جو برونی کے لئے تیار تھا، ہم اس پر سوار ہو کر برونی روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز ہم برونی پہنچ گئے، اور ایک ڈچ کے مکان میں ٹھہر گئے۔

برونی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ برونی شہر کی آبادی تقریباً ۲۰ ہزار ہے۔ ڈیکری ملائیز اور بیائیز یہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ کچھ لوگ وہاں پنیل کا سامان برتن وغیرہ عمدہ بناتے ہیں

برونی شہر عجیب و غریب ہے۔ سمندر سے تھوڑے فاصلہ پر دریائے لیبانگ کے کنارے اور وسط میں واقع ہے، اور شہر کی آبادی کا زیادہ حصہ دریا میں پانی کے اندر ہے۔ خشکی میں کنارے پر بازار اور مارکیٹ ہے اور بہت سے مکانات ہیں۔ شہر کے چاروں طرف سرسبز پہاڑ ہیں۔

سلطان کے مُشیر خاص اور ڈاکٹر دونوں انگریز تھے۔ میں پہلے ڈاکٹر سے ملا، پھر مُشیر سے مُلاقات ہوئی۔ اِن کے ذریعے سے ایک روز مجھے سلطان کی خدمت میں بھی باریابی کا موقع ملا۔ سلطان نہایت مہذّب اور تعلیم یافتہ انسان تھے، اور عرب تھے۔ انگریزی اور ملائی زبانیں خوب بولتے تھے۔ انگلستان کی بھی سیر کر آئے تھے۔ سلطان کا محل آبادی سے

ذرا ہٹ کر دریا کے کنارے پر قلعہ کی صورت میں ہے۔ مُشیر اور ڈاکٹر کے بنگلے خشکی پر تھے۔ ایک روز سلطان کی خواہش پر میں نے سارا مال اُن کو اور اُن کی بیگم صاحبہ کو دکھایا۔ بہت سا سامان اُنھوں نے پسند کیا، اور خریدا۔ اِس کے بعد سلطان نے مجھے سرکاری مہمان کی حیثیت سے اپنے ہاں رکھا۔ محل کے ایک حصّہ میں مجھے جگہ دی گئی، اور سرکاری باورچی خانہ سے میرے پاس کھانا اور ناشتہ آنے لگا۔ بروئی گو چھوٹی سی ریاست ہے مگر خود مختار و آزاد ہے۔ اپنی فوج ہے، پولیس ہے اور سب محکمے باقاعدہ ہیں۔ محل میں قیام کی وجہ سے مجھے سلطان تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ اکثر مجھے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا اور ہر مرتبہ وہ بکمال خندہ پیشانی و اخلاق سے پیش آتے تھے۔ وہ اکثر میری زبانی ہندوستان اور افریقہ کے حالات بڑی توجّہ سے سُنتے تھے۔ ہندوستان اتنے بڑے ملک کی غلامی پر اُن کو تعجّب اور افسوس تھا۔ اُن کو اس بات پر حیرت تھی کہ ہندوستان میں سات کروڑ مسلمان ہوں اور وہ بے بس و غلام ہوں۔ تاریخ سے اُن کو واقفیت تھی۔ سلطان محمود غزنوی اور دیگر مسلمان بادشاہوں سے وہ بخوبی تھے۔ افغانوں کی وہ تعریف کرتے تھے۔ افریقہ کے جنگلوں اور وہاں کے میرے شکار کے حالات سُنکر وہ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ ہماری ریاست کے جنگلوں میں بھی شکار

بہت ہے۔ ہم آپ کے لئے شکار کا معقول انتظام کردیں گے۔ میں نے وعدہ کیا کہ ایک ماہ کے بعد سارا واک سے واپسی پر انشاء اللہ ضرور شکار کی غرض سے حاضر ہوں گا۔

ایک روز میں نے اُن سے اثنائے گفتگو میں اُن سے شیانگ ڈاکو کے مقدمہ کی بابت دریافت کیا، اور اُن کے ہاتھوں خود اپنی تباہی کا حال بھی اُن کو بتلایا۔ انھوں نے فرمایا کہ اُن کے مقدمے کا فیصلہ تین روز کے بعد سُنا دیا جائے گا یعنی اُن کو موت کا حکم سُنایا جائے گا، جس کی تعمیل دوسرے ہی روز ہوگی۔ اِس مقدمہ میں شیانگ خود اور آٹھ اُس کے ساتھی ماخوذ تھے۔ اِن سب کو موت کا حکم سُنایا جانے والا تھا۔ میں نے دریافت کیا، کہ کیا اُنکو پھانسی پر لٹکایا جائے گا یا گولیوں سے اُڑا دیا جائے گا؟ سلطان نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا، کہ یہ دونوں طریقے یہاں رائج نہیں ہیں، یہاں ایک اور طریقہ ہے جو ہم آپ کو موقعہ پر دکھائیں گے۔

مجھے اب اُس دن کا شدت سے انتظار تھا، جس روز ڈاکوؤں کو موت کی سزا دی جانے والی تھی۔ میرے دل میں انتقام کے طور پر اُن کی موت کا نظارہ دیکھنے کی تمنا تھی۔ دراصل یہی انتقامی جذبہ مجھے یہاں تک لایا تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعہ کے روز صبح آٹھ بجے اُن سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

آخر خدا خدا کر کے جمعہ کی صبح نمودار ہوئی عجیب سماں تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل گھرے ہوئے تھے، ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے چل رہے تھے۔ مشرقی مطلع پر طلوع آفتاب سے قبل گہری اور سرخ روشنی ایک خوفی منظر کا مرقع پیش کئے ہوئے تھی۔ قلعہ سے باہر عین دریا کے کنارے ایک دو منزلہ بڑے مکان کے سامنے ایک وسیع میدان میں لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ صبح کے ۶ بجتے ہی اس میدان میں بڑے بڑے ڈھول بجنے لگے۔ لوگوں کا ہجوم دمبدم بڑھتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزارہا مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے جمع ہو گئے۔ دور دور سے لوگ ان ڈاکوؤں کی موت کا نظارہ دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے جنھوں نے بیشمار انسانوں کو انتہائی بے دردی سے قتل و غارت کیا تھا اور لاتعداد جہاز لوٹے اور تباہ کئے تھے۔ آج ان غارت گروں کا دنیا میں یہ آخری دن تھا اور اب ان کی زندگی کے صرف چند لمحے اور باقی تھے۔ ایسے ظالم و سفاک انسانوں کا آخر کار یہی انجام ہوا کرتا ہے جو اس وقت ان کا ہونے والا تھا میں اس عبرت ناک سماں سے بے حد متاثر تھا۔

ٹھیک سات بجے ڈھول بجنے موقوف ہو گئے، اور سلطانی بینڈ بجنے لگا، جس سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ سلطان کی آمد کا وقت قریب ہے۔ تھوڑی دیر میں سلطان مع مشیر و ڈاکٹر، امراء اور خاندان شاہی کے میدان میں تشریف لے آئے میں بھی ان کے ہمراہ تھا اور عنایت کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ سلطان کے

میدان میں پہنچتے ہی پیدل فوج اور رسالے نے سلامی اُتاری۔

سلطان ہم سب کو ساتھ لئے ہوئے لبِ دریا پختہ اور دو منزلہ مکان کی اُوپر کی منزل میں پہنچے۔ سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت مکان کی فصیل کے نیچے دریا میں عجیب خوفناک شور و ہنگامہ سُنائی دے رہا تھا۔ میں نے جھانک کر نیچے دریا میں دیکھا تو وہاں کا نظارہ دیکھتے ہی خوف سے میرا دل لرز گیا۔ میں نے دیکھا کہ سیکڑوں بڑے بڑے گھڑیال دریا میں جمع ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے اُوپر گرے پڑتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کے انتظار میں بیچین ہیں۔ اب یہ راز مجھ پر کھل گیا اور معلوم ہو گیا کہ یہاں پھانسی کا طریقہ رائج نہیں ہے اور مجرموں کو انھیں گھڑیالوں کے سامنے دریا میں پھینک دیا جاتا ہے، اور وہ آن کی آن میں اُسے تکّا بوٹی کر کے کھا جاتے ہیں۔ یہ گھڑیال ہمیشہ سے انسانوں کے کھانے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لئے ڈھول بجائے جاتے ہیں تو یہ گھڑیال بھی ڈھول کی آواز سُنکر جمع ہو جاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ ہماری خوراک آ رہی ہے۔ چنانچہ وہ سب اسی مکان کے نیچے جمع ہو کر بے چینی سے اپنی خوراک کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ یہ عجیب عبرتناک منظر تھا۔

تھوڑی دیر میں تو قیدی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سلطان کے سامنے... میدان میں لا کر کھڑے کر دیئے گئے، جن کے ساتھ مسلح پوری فوج تھی۔ وہ شاہی

جس کی ہیبت اور دہشت سے لوگوں کا زہر آب ہو جاتا تھا، جس کے نام سے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے، آج وہ کمال بیکسی و بے بسی کی حالت میں ہمارے سامنے کھڑا تھا، وہ ایک قیدی تھا، مجرم تھا۔

سلطان نے کھڑے ہو کر میدان کی جانب قیدیوں پر نظر ڈالی۔ بینڈ بجنا بند ہو گیا۔ سب لوگ مودّبانہ خاموش تھے۔ سلطان نے ملائی زبان میں ایک تقریر فرمائی جس کو لوگوں نے بہمہ تن گوش ہو کر سُنا، تقریر کے خاتمہ پر لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

اب سب لوگ دریا کے کنارے فصیل پر مجرموں کی موت کا دردناک نظارہ دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ چھ سپاہی ایک قیدی کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مکان کے نیچے کی منزل سے دریا کی طرف لے گئے، اُس کی زنجیریں کھولدیں، اور ایک سیٹی کی آواز پر اُس کو اُوپر سے ایک دروازہ کے راستہ سے دریا میں پھینک دیا۔ اُس کا پانی میں گرنا تھا، کہ گھڑیالوں میں ایک آفت برپا ہو گئی، اُس کے گرتے ہی سب بُری طرح اُس پر ٹوٹ پڑے اور اُس کا حصّہ بخرا کر ڈالا۔ پانچ منٹ میں پورا صاف تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ اب یکے بعد دیگرے سب قیدی اسی طرح دریا میں لا لا کر پھینکے گئے اور سبھوں کا یہی حشر ہوا۔ سب سے آخر میں سٹیا نگ کی باری تھی۔ اُس وقت اس مہیب و خوفناک ڈاکو کی وہ حالت نہ تھی جو میں ڈاکہ زنی کے

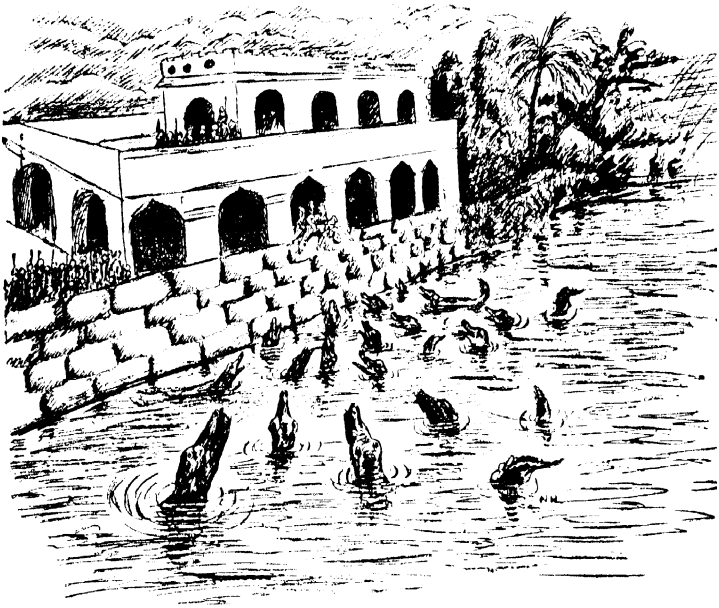

بحری ڈاکوؤں کی موت

وقت سمندر میں دیکھ چکا تھا۔ اُس وقت اِس کا رُعب غضب کا تھا، اسکی شکل سے خوف معلوم ہو رہا تھا، مگر اب مایوسی و بیکسی کا ایک مجسمہ تھا اور موت اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے چینی زبان میں چلّا چلّا کر کچھ کہنا شروع کیا، الفاظ مُنہ سے صاف نہ نکلتے تھے۔ ٹھیک ۸ بجے اُس کو بھی دریا میں پھینک دیا گیا۔ دس ہی منٹ بعد دنیا میں اُس کا وجود بھی نہ تھا۔ اِن کا خاتمہ ہوا اور بحری بھیڑیوں سے لوگوں کو نجات ملی۔

یہ گھڑیال خاص طور پر مجرموں ہی کے لئے پرورش کئے گئے تھے جو دریا کے ایک مخصوص حصّہ میں بند رہتے تھے، حدود سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ ہفتہ میں دو مرتبہ خوراک کے لئے مختلف جانور مار کر انکے سامنے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی مجرم اِن گھڑیالوں سے کسی طرح جان بچا کر دوسرے کنارے پر سالم نکل جائے، تو یہاں کے قانون کے مطابق وہ آزاد سمجھا جاتا ہے پھر اُس پر کوئی گرفت باقی نہیں رہتی، مگر ایسا موقع شاذ و نادر ہی ہوتا ہوگا۔

اِس عجیب و غریب نظارہ کا اثر میرے دل پر ایک مدت تک رہا۔ دوسرے روز ہم ایک جہاز کے ذریعہ میسیپی روانہ ہو گئے۔

باب پانچواں

ریاست ساراواک

جہاز اگلے دن صبح میسیری پہنچ گیا۔ اس مرتبہ ہم ایک کینیڈین کے مکان پر ٹھہرے۔ کھانے اور ناشتے کا انتظام عنایت نے کر لیا اور ہم نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

شہر میسیری مغربی بورنیو میں سمندر کے کنارے ڈچ ساراواک کے علاقہ میں واقع ہے۔ یہاں پٹرول کے بڑے بڑے کارخانے ہیں جن میں ہزارہا آدمی کام کرتے ہیں۔ امریکن۔ کینیڈین۔ ڈچ۔ ملائیز اور چینی لوگوں کی کثرت ہے۔ چند پنجابی چوکیدار بھی ہیں کئی بازار ہیں، مارکیٹ ہے، کھانے کے رسٹوران ہیں۔ بائیسکوپ بھی ہے۔ سڑکیں صاف ستھری ہیں۔ ایک امریکن ہوٹل سمندر کے کنارے بہت اچھی حالت میں ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہاں امریکن اور دوسرے لوگ ہر وقت تمباکو چباتے رہتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ان تیل کے کارخانوں میں کسی کو سگرٹ اور سگار پینے کی اجازت نہیں

ہے۔ کوئی شخص دیا سلائی لیکر وہاں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے اصلی باشندے ڈیکز ہیں۔ اِن کے نزدیک سیاہ دانت خوبصورتی میں داخل ہیں۔

تقریباً دو ہفتہ میں ہمارا سب مال فروخت ہو گیا۔ میں نئے مال کے لیے، لابون ہوتا ہوا سنگاپور کو روانہ ہو گیا اور پندرہ روز کے بعد مال لیکر واپس آ گیا۔ پٹرول کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کو ہر ہفتے معقول اُجرتیں ملتی تھیں وہاں کوئی غریب یا بیکار آدمی نہ تھا۔ اس لیے ایسی جگہوں میں قدرتاً کاروبار اچھا ہوتا ہے۔ اِس مرتبہ میں امریکن اور کینیڈا والوں کی ضرورت کے مطابق مال لایا تھا اس لئے بہت سا مال جلد فروخت ہو گیا۔

میسیری میں کاروبار تو خوب تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ میں شکار کا شغل بھی چاہتا تھا لیکن شکار کے مقامات یہاں سے دُور تھے۔ اِس خیال سے میں نے دوسرے پٹرول کے کارخانوں میں سفر کا ارادہ کیا۔ مارٹا پورا میں بھی پٹرول کے کارخانے ہیں جو جنوبی بورنیو کے ڈچ علاقہ میں ہے، مگر وہ جگہ دُور تھی۔ اِس لئے وہاں کا ارادہ تو میں نے ملتوی کر دیا، اور ریاست ساراواک جانے کے لئے تیار ہو گیا مجھکو ساراواک اور اُس کے جنگل دیکھنے کا بھی مدت سے شوق تھا۔ چنانچہ جب جہاز سٹیمر میسیری پہنچا، تو ہم اُس میں سوار ہو کر ساراواک کو روانہ ہو گئے۔ راستہ میں جہاز چند گھنٹے ہنٹالو بندرگاہ پر ٹھہرا۔ تین دن کے سفر کے بعد ہم سلما واکہ پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑا بندرگاہ ہے۔

اِس ریاست کا صدر مقام کوچنگ ہے جو سمندر سے تقریباً ۴ میل کے فاصلہ پر دریائے سارا واک کے کنارے پر آباد ہے۔ اِس دریا میں کوچنگ تک چھوٹے سٹیمر آتے جاتے ہیں ہم ایک سٹیمر کے ذریعہ کوچنگ پہنچے۔

کوچنگ دریا کے کنارے پر بہت خوبصورت اور بڑا شہر ہے۔ مکانات کچھ تو دریا کے اندر پانی میں ہیں، اور پختہ مکانات، بازار، مارکیٹ وغیرہ خشکی میں کنارے پر دُور تک پھیلتے ہوئے چلے گئے ہیں ہم کو ایک کرایہ کا مکان مارکیٹ کے قریب مل گیا۔ شہر سے باہر چاروں طرف جنگل اور پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ چینی لوگوں کی آبادی یہاں بھی خاصی ہے، اور سب طرح کے کاروبار انھیں لوگوں کے قبضہ میں ہیں۔ اِن جزائر میں وزن ترازو سے کام نہیں لیا جاتا، بلکہ پیمانے سے ناپکر کاٹی کے حساب سے فروخت کرتے ہیں۔ ایک کاٹی کا وزن کم و بیش تین پاؤ کے قریب ہوتا ہے۔ ڈالر کا انداز سب جگہ برابر ہے۔ ملائی اور انگلش زبانیں یہاں بولی جاتی ہیں۔

دریا کے کنارے چھوٹے سے قلعہ کی شکل میں ریاست کے راجہ کا محل ہے اور قلعہ سے قریب ہی فوج کی بارکیں ہیں۔ فوج میں سپاہی ڈیگز اور ملائیز ہیں اور آفیسر انگریز ہیں۔

مجھے یہاں یہ معلوم ہوکر تعجب ہوا کہ یہاں کا انگریز حکمراں راجہ کہلاتا ہے۔ ایک صدی کے قریب زمانہ گذرا کہ ایک انگریز سر جیمز بروک کچھ فوج کے ساتھ اس حصّہ

ملک میں داخل ہوئے، اور کچھ مقامی مدد اُن کو حاصل ہوگئی۔ ایک عرصہ کی خونریز جنگ کے بعد وہ سلطان سے یہ علاقہ فتح کرکے ساری ریاست پر قابض ہوگئے اور سر جیمز بروک نے اپنا لقب راجہ رکھا۔ اُن کے بعد بھی وہاں کے انگریز فرمانروا اب تک راجہ ہی کہلاتے ہیں۔

بڑی ریاست ہے۔ پیداوار خوب ہے۔ کانوں سے لوہا، سونا، پارہ اور سُرمہ وغیرہ کی بے حساب آمدنی ہے۔ جنگلوں سے بیسوں قسم کی عمارتی لکڑی آتی ہے، جن میں آئرن وُوڈ بھی شامل ہے۔ یہ سب پیداوار یورپ اور امریکہ کو بھیجی جاتی ہے۔ اس تجارت میں چینی لوگ زیادہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور وہ بہت خوشحال ہیں۔ اِس تجارت میں کچھ مقامی لوگوں کا بھی حصّہ ہے۔ دریائے سارا واک کے علاوہ یہاں ریجانگ بھی ایک بہت بڑا دریا ہے جس میں بڑے سٹیمر بآسانی چلتے ہیں۔ جنگل کی پیداوار اِن دریاؤں کے راستے سے جہازوں تک پہنچانے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔

جیمبوس میں سونے کی ایک بہت بڑی کان ہے، جس میں ہزارہا چینی کام کرتے ہیں۔ دریائے سارا واک میں ہر وقت سیکڑوں کشتیاں اور جہاز آتے جاتے رہتے ہیں، جن کی آمد و رفت سے دریا میں خوب رونق رہتی ہے۔ برٹش اور ڈچ بورنیو اور سارا واک کے شہروں میں ٹیلیگراف کے آفس موجود ہیں، اور اب تو وہاں ٹیلیفون اور وائرلیس سٹیشن بھی قائم ہوگئے ہیں۔

یورپینوں کی یہاں خاصی آبادی ہے

یورپین کمپنی کے دفتر دریا کے کنارے خشکی پر ہیں۔ سونے۔ پارے اور سرمہ وغیرہ کی کانوں کا انتظام اسی کمپنی کے ہاتھ میں ہے شمالی سارواک کے جنگلوں میں ایک قسم کا پھل پیدا ہوتا ہے جس سے کاغذ بنایا جاتا ہے اس کی بڑی بڑی بیلیں درختوں پر چڑھا دی جاتی ہیں۔ پھل تیار ہو جانے پر اُس کو مشینوں سے پیسکر یورپ بھیج دیتے ہیں، اس سے وہاں کاغذ بنایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں یہ کاغذ بنانے کا پھل مالابار اور ٹراونکور (جنوبی ہند) میں پیدا ہوتا ہے جو انگلستان بھیجدیا جاتا ہے۔

سارے بورنیو کی تجارت کا ایک بڑا حصہ یورپ کے ساتھ ہے، سب پیداوار وہاں بھیجدی جاتی ہے۔ جنوبی بورنیو میں سونے کی کانوں کے علاوہ پلاٹینم اور ہیرے کی کانیں بھی ہیں۔ سب سے بڑی ہیرے کی کان مارٹا پورا جنوبی حصہ ملک میں ہے جہاں سرکاری کارخانہ بھی ہے۔

بورنیو میں لاتعداد قیمتی کانیں ہیں جس کی مثال دنیا میں دوسری جگہ کم ہے۔ جنگلوں کی کافی آمدنی ہے۔ ابھی تک ملک میں ہزاروں میل رقبہ خالی پڑا ہوا ہے، وہاں خدا جانے کس قدر دولت کے خزانے زمین کے اندر موجود ہوں گے۔ غیر ملک کے لوگوں میں انگریز، ڈچ، امریکن اور چینی بہت زیادہ

فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ بدنصیب ہندوستان کے لوگ جو وہاں ہیں وہ سپاہی ہیں یا چوکیدار۔ کوئی بڑی تجارت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں ہے نہ وہ وہاں کی کانوں اور جنگلوں کی پیداوار سے کوئی فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اگر ہندوستانی چاہیں تو آج بھی وہاں کافی گنجائش ہے، زمین آسانی سے مل سکتی ہے جنگل ٹھیکہ پر لئے جا سکتے ہیں، کاشت سے جنگلوں کی پیداوار سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ مگر ایسے کاروبار کے لئے وہاں مستقل سکونت اور سرمائے کی ضرورت ہے، یہ دو چار سال کا کام نہیں ہے اور مشترکہ کمپنیوں کا کام ہے۔ انفرادی طور پر ہر شخص ہر حصہ ملک میں چل پھر کر یا صرف ایک جگہ قیام کر کے کچھ سرمائے سے عمدہ کاروبار کر سکتا ہے۔ گو وہ ملک چھوڑے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے مگر پھر بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کی کاروباری حالت ہمارے ہندوستان سے بدرجہا بہتر ہے۔ ہر شعبہ میں وہاں زیادہ تر چینیوں سے مقابلہ ہے لیکن اعلیٰ طبقہ میں وہاں کاروبار کی گنجائش ہے اور خود اپنی حالت کو اچھی سفید پوش رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

سنگاپور میں ہر قسم کا تجارتی مال ملجاتا ہے۔ خود خرید کر وہاں سے لائیں یا براہِ راست دوکانداروں سے منگواتے رہیں۔ بورنیو میں وی۔ پی سسٹم موجود ہے اور بنکوں کی معرفت بھی مال منگوایا جا سکتا ہے۔ وہاں سے کاؤر، ساگو دانہ، سپاری اور ناریل وغیرہ ہندوستان کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔

یوں تو بیسیوں قسم کی عمارتی لکڑیاں یہاں سے یورپ اور امریکہ کو بھیجی جاتی ہیں مگر یہاں کی مشہور اور قیمتی لکڑی آئرن وُوڈ ہے۔ یہ بہت نایاب لکڑی ہے۔ یہ بورنیو کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی۔ بالکل لوہے کیطرح وزنی ہوتی ہے اور پانی میں ڈوب جاتی ہے۔

بورنیو کے جنگلوں کی پیداوار اور وہاں کی کانوں کی کثرت دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ دولت کے کس قدر خزانے قدرت نے وہاں دفن کر رکھے ہیں جن کا بہت سا حصہ ابھی بند پڑا ہے۔ اس جزیرہ میں پلاٹینم۔ ہیرے اور سونے جیسی قیمتی اشیا کثرت سے برآمد ہو رہی ہیں جسکی نظیر دنیا میں اور جگہ نہیں ہے۔

بورنیو کے سمندروں میں سے بھی بہت سی قسم کا تجارتی سامان نکلتا ہے۔ سب سے زیادہ مچھلی ہے جس میں شارک مچھلی بھی شامل ہے۔ سوکھی مچھلیاں باہر بھیجی جاتی ہیں جو مقامی اور زیادہ تر چینی اس کام کو کرتے ہیں۔ سیپ اور دیگر چیزیں بھی سمندر سے نکالی جاتی ہیں۔

شہر کوچنگ میں کاٹھیاوار کے مسلمانوں کی ایک دوکان تھی جس میں کپڑے اور غلّہ کا کاروبار تھا۔ سلیمان اور عثمان دو نوجوان بھائی اس دوکان کے مالک تھے۔ یہ اہلِ سنّت جماعت تھے۔ سلیمان کو شکار کا شوق تھا اور اُن کے پاس بندوق بھی تھی۔ ہندوستانی ہونے کی وجہ

سے ملاقات ہوگئی۔ انھیں یہ معلوم ہوکر کہ مجھے بھی شکار کا شوق ہے، بڑی خوشی ہوئی۔ ہم باہم روزانہ ملتے رہتے تھے۔ چند روز تک ہم اپنے کاروبار میں مصروف رہے پھر ایک روز سلیمان کے اصرار پر ہم شکار کے لئے تیار ہوگئے۔ انھوں نے بہت سا کھانا اور ناشتہ تیار کرا کر اپنے ساتھ لے لیا۔

صبح ہی سے اُن کے ہاں شکار کی تیاری کا ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ دوستوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ وہ جا تو رہے تھے جنگل میں صرف ہرن کے شکار کیلئے مگر اُن کے اس اہتمام سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ کسی بڑی مہم کیلئے تیاری کر رہے ہیں۔ پھر کپڑے پہنے گئے۔ برجس پہنی، بوٹ پر پٹیاں باندھیں۔ پیٹی میں کارتوس لگا کر کمر میں سجائے گئے۔ شکاری چاقو لگایا گیا۔ اس کے بعد بازو پر تعویذ باندھے گئے، کوٹ پہنا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر دعائے گنج العرش پڑھی۔ اُنکے چھوٹے بھائی عثمان اور ایک بوڑھے ملازم نے اُن کے گرد کھڑے ہوکر درود شریف پڑھ کر اُن پر دم کرنا شروع کیا۔ اُن کی سلامتی اور کامیابی کی دعائیں ہو رہی تھیں۔ غرض یہ سب ایک بڑی خطرناک مہم کی تیاری میں مشغول تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھکر میں ہنسی کو ضبط نہ کرسکا۔ آخر صدقہ و خیرات ادا کرکے اس شان سے گھر سے روانہ ہوئے کہ کندھے پر دونالی بندوق تھی۔ عزیزوں اور دوستوں کا ہجوم ساتھ تھا۔ دریا کے گھاٹ پر پہنچے، سٹیمر پر سوار ہوئے جو کچھ ہی دیر بعد روانہ ہوگیا۔ ہمارے ساتھ عنایت اور ایک اُن کا ملازم تھا۔

۳۰ میل کا فاصلہ ہم نے بذریعہ سیٹر طے کیا اور ایک گاؤں میں پہنچے۔ وہاں انناس نہایت شیریں ملے جو لیکر خوب کھائے گئے۔ یہیں سے دو گھوڑے کرایہ پر لیکر تقریباً ۱۲ میل سفر طے کرکے پہاڑ کے دامن میں ہم ایک موضع میں وارد ہوئے۔ وہاں ایک چینی دوکاندار کے مکان پر قیام کا انتظام کیا جس نے ہم کو ایک علیحدہ کمرہ دیدیا اور ہمارے آرام کا پورا انتظام کردیا۔ کھانا ہمارے ساتھ ہی موجود تھا۔ یہ گاؤں عین پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، تھوڑے ہی فاصلہ پہ بڑا گھنا جنگل ہے اور کاپو پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے جو وسط ملک میں کوہ آرن تک چلا گیا ہے۔ ان پہاڑوں اور نیز ان کے دامنوں میں نہایت ہی گھنے جنگل تھے جن میں خونخوار درندوں کی بڑی کثرت تھی۔ ان جنگلوں میں ہماری رہبری کے لئے ہمارے ہمراہ کوئی بھی نہ تھا۔ سلیمان شکاری نہ تھے محض شوقین تھے۔ میں نے اس موضع میں واقف کار لوگوں کو تلاش کیا جو ہمارے ساتھ ان جنگلوں میں چل سکیں۔ شام کے وقت میں چند لوگوں سے ملا، اُن سے معلوم ہوا کہ کاپو پہاڑ کچھ زیادہ بلند نہیں ہے، اس کی بلند چوٹیاں پانچ ہزار فیٹ تک آونچی ہیں اور وہاں بھی گھنے جنگلوں کی یہی کیفیت ہے۔ جن میں ہرنوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ سؤر۔ بھالو۔ شیر۔ چیتے بھی بکثرت ہیں۔ جابجا پہاڑوں پر جنگلی وحشی قومیں بھی آباد ہیں۔ انھیں گاؤں والوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آٹھ دس میل تک جنگل میں مختلف پیداوار کی وجہ سے لوگوں

کی آمد و رفت کثرت سے رہتی ہے، اس لئے خطرناک جانور دُور اور پہاڑوں کی بلندی پر پائے جاتے ہیں اور قریب کے جنگلوں میں عموماً سور اور ہرن ہیں۔ اُنھوں نے یہ بھی بتلایا کہ کاپوا کے جنگلوں میں سب سے زیادہ خطرناک جانور بورنیو کا گوریلا بندر (بن مانس) ہے جو بڑا طاقتور اور نڈر ہوتا ہے۔ اکثر وہ شکاریوں کو اُٹھا لیجاتا ہے اور بندوق کو ہاتھ سے توڑ ڈالتا ہے وغیرہ وغیرہ

یہ تمام حالات سلیمان صاحب نے بھی سُنے۔ مگر اُنھوں نے .....

اِس بات کا پورا اطمینان کر لیا کہ دو تین میل تک ان جنگلوں میں ہرنوں کے سوا اور کوئی دوسرا جانور نہیں ہے۔ دوسرے دن وہ صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر شکار کے لئے تیار ہوئے۔ ہم چار آدمی تو تھے ہی ایک آدمی کو گاؤں سے بھی ساتھ لے لیا۔ ایک میل کے بعد ہی جنگل میں ہرنوں کی شکل نظر آنے لگی۔ دو گھنٹے کے اندر ہی سلیمان نے یکے بعد دیگرے دو ہرن شکار کئے اور کچھ پرندے بھی مار لئے۔ اب کیا تھا، اپنی اس کامیابی پر میدانِ شکار سے نہایت خوش خوش بہادرانہ اور دلیرانہ انداز سے واپس آئے۔ خوشی کے مارے جامہ میں پھولے نہ سماتے تھے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ بدقسمتی سے اس چھوٹے اور مختصر سے گاؤں میں کوئی ٹیلیگراف آفس موجود نہ تھا، ورنہ احباب اور بھائی کو فوراً اپنی شکار کی کامیابی کی اطلاع بذریعہ تار دی جاتی۔ دیر تک ہرنوں کے مارنے، گرانے اور ذبح کرنے کے واقعات بالتفصیل بیان فرمایا کئے، جیسے ہم

بھی خاطر اور دلچسپی سے سُنا۔ دن ہم نے گاؤں ہی میں بسر کیا۔ شام کو سلیمان دوبارہ بندوق لے کر تھوڑی دور چلے گئے اور وہاں سے ایک خرگوش اور چند پرند شکار کر لائے۔ میں مکان ہی پر پڑا رہا۔ اپنے میزبان چینی کے اندرونِ صحن میں میں نے دیکھا کہ ایک طویل القامت موٹا سیاہ سانپ تھا جس کی لمبائی کسی طرح دس بارہ فیٹ سے کم نہ تھی، بڑے اطمینان کے ساتھ پھر رہا ہے اور اُس چینی کے چھوٹے بچے اُس کے قریب کھیل رہے ہیں۔ مجھے یہ دیکھکر کمال حیرت ہوئی۔ بعد میں مالکِ مکان سے معلوم ہوا کہ اُس نے اس سانپ کو پال رکھا ہے، اور یہاں گھروں میں عام طور پر پرانے اور بڑے سانپوں کے پالنے کا شوق ہے، وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ وہ چینی مجھے سانپ کے قریب لے گیا جسے ہم دیر تک بیٹھے دیکھا کیے۔ چینی نے ایک مُرغی کا چوزا اُس کے سامنے چھوڑ دیا جس کو سانپ نے پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ نگلنا شروع کر دیا۔

دوسرے روز صبح سلیمان ایک اور ہرن مار لائے۔ ان جنگلوں میں ہرنوں کی اس درجہ کثرت ہے کہ ان کا شکار چنداں دشوار نہیں ہے۔ سلیمان نے اب کافی شکار کر لیا تھا اور چونکہ اُن کا دل سیر ہو چکا تھا اس لئے اُنھوں نے واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔

میں نے گاؤں میں بہتیری کوشش کی کہ مجھے زیادہ نہیں صرف دو ہی

آدمی ولیر اور شکاری ملجائیں جو میرے ہمراہ پہاڑوں تک جنگل میں جاسکیں اور جن کے لئے میں معاوضہ بھی کافی دینے پر آمادہ ہوا، مگر افسوس کہ کوئی آدمی نہ ملا اور سلیمان مجھے کو چنگ واپس لے آئے۔ یہاں آنے پر بھی مجھے شکار کا خیال لگا رہا اور بڑے جنگلوں کو دیکھنے کی حسرت باقی رہ گئی۔

باب چھٹا

ریاست برونی کے جنگلوں میں شکار

اب میں نے کو چنگ اور سارا واک کو جلد چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے سلطان برونی سے وعدہ کیا تھا کہ میں دوبارہ صرف شکار کی غرض سے برونی حاضر ہوں گا اور سلطان نے میرے شکار کے متعلق انتظام کر دینے کے لئے ارشاد فرمایا تھا۔ میں عنایت کو لے کر کو چنگ سے روانہ ہو گیا اور سارا واک سے سٹیمر میں سوار ہو کر میسیری آگیا۔ ایک دن وہاں ٹھہرا۔ میرے پاس جو کچھ نقد روپیہ تھا اُس میں سے کچھ خرچ کے لئے رکھکر باقی سب سنڈکین بنک میں بھیج دیا۔ دوسرے روز ہم بذریعہ کشتی برونی پہنچے۔ وہاں

پہنچکر معلوم ہوا کہ سلطان صاحب فراش ہیں، اُن کے پیر میں زخم ہوگیا تھا جس کا آپریشن کیا گیا ہے تاہم پہلے کی بہ نسبت اب رو بصحت ہیں۔ چند روز کے قیام کے بعد سلطان سے نیاز مند ہوا، وہ بکمال اخلاق پیش آئے اور مجھے دیکھکر بہت مسرور ہوئے۔ میں نے اُنھیں علیل دیکھ کر شکار کے متعلق اُن سے کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن اُنھیں خود ہی یاد آگیا اور فرمایا کہ غالباً آپ شکار کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا خیال صحیح ہے۔ اس پر اُنھوں نے داروغہ شکار کو طلب فرمایا اور شکار کے متعلق تمام انتظام کردینے کی ہدایت فرمائی۔

داروغہ شام کے وقت میرے پاس آیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کے ہمراہ جانے کے لئے کتنے آدمیوں کا بندوبست کیا جائے؟ میں نے جواب دیا کہ میرے ساتھ جانے کے لئے چار پانچ آدمی کافی ہوں گے۔ اُس نے کہا کہ یہ جنگل اور پہاڑ خطرناک ہیں، مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کی ہمراہی میں بیس آدمی سے کم نہ ہوں، دو گھوڑے آپ کی سواری کے لئے ساتھ رہیں گے۔ کچھ گھوڑے رسد اور خیموں وغیرہ کے سامان کی باربرداری کے لئے ساتھ ہوں گے۔ جتنے آدمی آپ کے ہمراہ ہوں گے وہ سب راستوں سے اور شکار سے بخوبی واقف ہیں۔ تین سرکاری شکاری بھی آپ کے ساتھ جائیں گے۔ اُن کے ساتھ بندوقیں اور سامان و گھوڑے وغیرہ سب ہوں گے۔

دوسرے روز سب سامان تیار تھا۔ میں نے اپنے سامان کے بکس وغیرہ

داروغہ کے پاس رکھدیئے۔ روانگی سے قبل شام کے وقت میں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے مجھ سے استفسار فرمایا کہ آپ کے ساتھ بڑے شکار کے لئے کونسی رائفل ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس امریکن رائفل ۴۰۵ بور ہے تو انھوں نے اس کو منگوا کر ملاحظہ فرمایا اور اطمینان ظاہر کیا، اور ارشاد فرمایا کہ بڑے جنگلوں میں آپ کے پاس صرف ایک ہتھیار کافی نہیں ہو سکتا ہے، اس کے بعد انھوں نے ایک امریکن پستول اور اس کے کارتوس مجھے عنایت فرمائے پستول ایک چمڑے کے بیگ میں ملفوف تھا اور کارتوس پیٹی میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے بہ ادب لے لیا اور شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے دن علی الصباح ہم روانہ ہوئے۔ اپنے شکار کی تیاری دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی، بلا مبالغہ ایک پورا قافلہ میرے ساتھ تھا۔ دو گھوڑے میرے سواری کے لئے تھے، تین شکاری معہ اپنی بندوقوں و کارتوسوں اور گھوڑوں کے ساتھ تھے۔ چھ گھوڑے اور تھے جن پر رسد اور سامان تھا۔ ہم کل ۲۶ آدمی اور ۱۱ گھوڑے تھے۔ دوسرا گھوڑا جو میری سواری کے لئے تھا، اس پر میں نے عنایت کو سوار کرا دیا۔

سلطان کی اس قدر عنایت و اخلاق کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں بہت ہی ممنون کرم اور شرمندہ ہوا کہ میں نے ناحق ان کو اتنی تکلیف

دی۔ میری یہاں آنے کی غرض و غایت تو صرف یہ تھی کہ سلطان کے ذریعہ سے چار پانچ واقفکار آدمی مل جائیں اور بس اور اُن کے اخراجات کا متحمل بھی میں خود ہی ہوں۔ اس الطاف خسروانہ کی کیا خبر تھی۔ سب سامان رسد وغیرہ ہمارے ساتھ سرکاری تھا۔ اتنا سامان اور اہتمام دیکھکر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو اس شکار میں کم از کم دو ایک مہینے گذارے جائیں۔ خصوصاً اس لئے کہ ایسا نادر موقع ایک عرصہ بعد میرے ہاتھ آیا تھا۔

مختلف قسم کے فارموں اور دیہاتوں میں سے ہو کر ہم گزر رہے تھے حتیٰ کہ ۱۵، ۱۶ میل سفر طے کرنے کے بعد دوپہر ہو گئی اور ایک ندی کے کنارے پہنچے، قریب ہی ایک موضع تھا جس کے باہر کیمپ کر دیا گیا، باربرداری کے قلیوں نے ایک صاف جگہ دیکھ کر ہمارا خیمہ نصب کر دیا۔ بقیہ چھولداریاں ہمارے خیمہ کے ارد گرد لگا دی گئیں۔ یہاں دو ہرن شکار کئے گئے۔ ناشتہ ساتھ تھا، کافی بھی بنالی گئی۔ ملک بورنیو کے تمام علاقے میں کافی پینے کا عام رواج ہے اور بغیر دودھ کے پیتے ہیں۔ چنانچہ سامانِ رسد میں کافی بھی ہمارے ساتھ تھی جو ناشتے کے ساتھ، نیز کھانے کے بعد ہمارے لئے تیار ہوتی تھی۔ یورپین میں صرف اہل چین چائے پیتے ہیں اور وہ بھی گرم چائے نہیں پیتے بلکہ چائے تیار کر کے

اُس کو ٹھنڈا کر لیتے ہیں اور پیاس کے وقت چند گھونٹ پی لیا کرتے ہیں۔ ہمارے کیمپ میں بڑی چہل پہل تھی تین شکاری جو ساتھ تھے، وہی میری خدمت پر مامور تھے اور ناشتہ وکھانا وغیرہ وہی لاکر کھلایا کرتے تھے۔ یہ تینوں برونی کے باشندے، مسلمان ڈیکز تھے۔ احمد، اسلام اور جالو ان کے نام تھے جو بڑے شجاع، دلیر اور بہترین شکاری تھے۔ انھوں نے بیان کیا کہ چند سال قبل سلطان کو شکار کا بیحد شوق تھا اور یہ تینوں شکاری اُن کے ساتھ رہتے تھے لیکن اب ضعیف و کمزور ہو جانے کی وجہ سے سلطان نے شکار کھیلنا موقوف کر دیا ہے۔

جن جنگلوں میں ہم جا رہے تھے اُن میں جنگلی ہاتھیوں کے علاوہ باقی ہر قسم کے درندے بکثرت ہیں، جنگلی بیل بھی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان جنگلوں میں ہاتھی نہیں ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ خطرناک گوریلا کی قسم کا بڑا بندر (بَن مانس) بہ افراط ہے۔ انھیں تینوں شکاریوں نے مجھے بتلایا کہ یہ بن مانس ان جنگلوں میں تمام جانوروں سے زیادہ خطرناک ہیں اور یہ معلوم ہو کر مجھے بیحد تعجب ہوا۔ میں نے افریقہ کے جنگلوں میں گوریلا بندر اکثر دیکھے تھے لیکن وہ کبھی بھی ہم پر حملہ آور نہ ہوئے تھے اور نہ ہم نے اُنھیں ستایا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ مشرقی افریقہ کے جنگلوں میں ان بڑے اور خطرناک قسم کے گوریلا بندروں کا وجود ہی نہ ہو جیسا کہ

سنٹرل افریقہ یا صحرائے اعظم اور کانگو وغیرہ میں ہے۔ دیکھنے پر اس حقیقت کا اظہار ہوا کہ یہ گوریلا بلا کا خطرناک اور نڈر جانور ہے جس کا قد عموماً ۶ فٹ سے بھی زیادہ پایا جاتا ہے اور جو غیر معمولی طاقت کا ایک درندہ ہے۔

بورنیو کے جنگلوں میں بندروں کی بڑی کثرت ہے اور ان کی بے شمار قسمیں پائی جاتی ہیں جن میں اورنگ اوٹن، گیبن اور بیبون بڑی قسمیں ہیں جو بہت گھنے جنگلوں میں رہتی ہیں۔

اورنگ اوٹن بن مانس کی شکل کا بندر ہے جو افریقہ کے گوریلا بندروں سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے بازو، ہاتھ لمبے اور بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ بدن بھاری اور سینہ چوڑا ہوتا ہے۔ قد پانچ فٹ تک ہوتا ہے۔ یہ بڑا طاقتور ہے اور گیبن اس سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے۔

بیبون بندروں کی ایک عجیب قسم ہے۔ اگر وہ دور سے جنگل میں نظر آئے تو اس پر ایک چھوٹے شیر ببر کا یقینی شبہہ ہو جائے اس لئے کہ اس کی گردن اور اگلے حصہ پر بعینہٖ شیر ببر کی مانند لمبے لمبے اور گھنے بال ہوتے ہیں اور بہ یک نظر یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آیا یہ شیر ببر ہے یا بیبون۔ ہاں جسم کا پچھلا حصہ البتہ صاف اور پتلا ہوتا ہے اور دم لمبی ہوتی ہے۔ یہ اس درجہ خوفناک و خطرناک ہوتے ہیں کہ یہاں کے جنگلی اور وحشی لوگ بھی ان سے پناہ مانگتے ہیں اور یہ شیر سے بھی زیادہ خوفناک و ہلاکت آفریں ہوتا ہے،

اس لئے کہ اگر شیر حملہ آور ہو تو اُس سے درخت پر چڑھ کر بھی جان بچائی جاسکتی ہے، مگر اس بلائے بے درماں سے تو درخت پر چڑھ جانے کی حالت میں بھی مفر نہیں اور یہ وہاں بھی پہنچکر حملہ آور ہوتا ہے، لیکن یہ غنیمت ہے کہ یہ موذی جانور سب جنگلوں میں نہیں ہے بلکہ خاص طور پر سنان کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ درخت اس کا مسکن ہیں اور جنگلی پھل ان کی خوراک۔

میں نے بورنیو جانے سے قبل سنگاپور کے میوزیم (عجائب خانہ) میں ان جانوروں کو مُردہ حالت میں دیکھا تھا اور وہیں مجھے ان کے نام معلوم ہوئے تھے۔ ہاں اس کا علم البتہ اُس وقت تک نہ ہوا تھا کہ یہ اس درجہ خطرناک اور مکلّف ہیں۔ یہاں کا ہر شکاری ان سے لرزاں و ترساں ہے اور شیر سے اتنا خوف نہیں کھاتا جتنا کہ ان سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ اورنگ اوٹن جب جنگل میں چیختا ہے تو اس کی درشت و کرخت آواز میلوں سے سُنائی دیتی ہے۔

دوسرے دن صبح ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد احمد نے روانگی کی گھنٹی بجائی۔ مزدوروں نے سب سامان باندھ کر گھوڑوں پر بار کر دیا اور تھوڑی دیر بعد ہم روانہ ہوئے۔ میرے ہمراہی سب شکار کے قواعد سے بخوبی واقف تھے۔ تین دنوں تک ہم مسلسل ندی، نالے،

پہاڑ اور جنگلوں کو طے کرتے رہے اور بالآخر اب ہم سارا واک کے جنگلوں میں پہنچ گئے جہاں کوہ مولو کا سلسلہ ہمارے پیش نظر تھا۔ ہم گھنے اور بڑے جنگلوں میں داخل ہو چکے تھے۔ پانچویں روز بیس میل کا اور سفر طے کر کے شام کے وقت ہم ایک پہاڑی راستہ پر جا رہے تھے اور ایک سلسلۂ کوہ پر سے گذر رہے تھے، ہمارے سامنے ایک عجیب دلکش منظر تھا اور نشیب میں ایک نہایت ہی جاذب نظر مرغزار جس میں سے صاف و شفاف چھوٹی چھوٹی بلوریں ندیاں پھوٹ پھوٹ کر نکل کھاتی ہوئی بہ رہی تھیں اور چٹانوں کے اندر پانی کے دلفریب حلقے بنا رہی تھیں۔ ان کی آوازوں میں ایک وجد آور دلکش صدائے موسیقی پیدا تھی۔ جا بجا جنگلی پھولوں کے تختے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے، جس سے ایک عجیب محویت کا عالم طاری ہوتا تھا۔ الغرض پہاڑوں اور گھاٹیوں کے درمیان یہ ایک نہایت ہی خوش منظر مرغزار تھا۔ پھر یہاں سے گزر کر ہم نے ایک درّہ کو طے کیا، جس کے بعد مولو پہاڑ کی ۹ ہزار فٹ سے بلند چوٹیاں ہمارے سامنے سر بفلک تھیں۔ اسی خوش منظر میدان میں ہم نے اپنا کیمپ کر دیا۔ عرصہ کے بعد مجھے گھوڑے پر چڑھنے کا اتفاق ہوا تھا متواتر کئی دنوں سواری کرنے کی وجہ سے تکان محسوس ہو رہا تھا اسلئے میں نے دو روز کیمپ میں آرام کیا۔ گھوڑوں کے چرنے کے لئے ہر طرف خوب سبز گھاس تھی۔ پہاڑوں سے آبشار گر کر دور تک بہتے نظر آ رہے تھے۔ سلام

اور جالو روزانہ پرندوں اور ہرنوں کا شکار کرتے رہتے تھے اور وہی پک کر ہمارے لئے آجاتا تھا اور عنایت صرف روٹی پکالیا کرتا تھا۔ ہمارے کیمپ والے خشک مچھلی بھون کر بڑے شوق سے کھاتے تھے لیکن وہ مجھے مرغوب نہ تھی۔ میں دو روز تک کیمپ ہی میں پڑا رہا البتہ تینوں شکاری جنگل میں جا جا کر شکار کے موقعے ڈھونڈتے رہے۔ احمد کا خیال یہ تھا کہ رات کے وقت کسی پانی کے گھاٹ پر بیٹھا جائے۔ چنانچہ کیمپ سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ایک چشمہ کے کنارے دو مچان قریب کے درختوں پر بنائے اور سہ پہر کے ناشتہ کے بعد ہم چاروں وہاں پہنچ گئے۔ ایک مچان پر احمد میرے ساتھ بیٹھ گیا اور دوسرے مچان پر اسلام و جالو جا بیٹھے اور انھیں ہدایت کر دی گئی کہ وہ ہرن یا کسی چھوٹے جانور پر گولی نہ چلائیں۔ ریچھ کو بھی نظر انداز کر دیں اور صرف شیر یا چیتے وغیرہ سامنے آنے پر فائر کریں۔

شام ہو گئی تھی، سورج غروب ہو چکا تھا۔ تمام جنگل پر ایک خوفناک خاموشی اور تاریکی چھا چلی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے اوجھل ہونا شروع ہو گئیں ہم درختوں پر چھپے بیٹھے تھے۔ میرے ہمراہی چونکہ سب شکاری تھے اور شکار کے اصول سے بخوبی واقف تھے اسلئے وہ بھی نہایت ہی خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ میں جانتا تھا کہ بڑے جانور ۱۲ بجے سے قبل گھاٹ پر پانی پینے نہیں آئیں گے۔ جنگل میں جانوروں

کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ جنگلی سؤر اور ہرن لمحہ بہ لمحہ نظر سے گزرتے اور گھاٹ پر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ طرح طرح کے جانوروں کے بولنے کی آوازیں پے بہ پے آرہی تھیں۔

آخر ۱۲ بج گئے۔ ہمارا مچان کچھ زیادہ آرام دہ نہیں تھا، اس لئے بیٹھنے میں مجھے تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بجے کے قریب اسلام نے بڑی آہستگی سے سیٹی دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کوئی بڑا جانور چشمہ پر آرہا ہے، چنانچہ ہم باخبر ہو کر مستعد ہو بیٹھے۔ کچھ پیروں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ جس سے ہم سمجھ گئے کہ یہ شیر اور چیتا نہیں بلکہ کوئی اور جانور ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ چشمہ پر تین سانبھر موجود ہیں۔ ایک بڑے لمبے سینگوں والا نر ہے اور دو مادہ۔ چونکہ ان کا شمار بھی بڑے جانوروں میں تھا اس لئے انھیں چھوڑا نہ گیا۔ میں تیار تو تھا ہی نر کے سینہ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ میرے فائر کے ساتھ ہی دوسرے مچان سے بھی دو مسلسل فائر ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں نر اور دونوں مادہ چشمہ سے کچھ فاصلہ پر جا گرے۔ وہ دونوں شکاری اس بات کو جانتے تھے کہ میں نر پر ضرور گولی چلاؤں گا اس لئے دونوں مادین کو انھوں نے اپنا شکار بنا لیا۔ رات کا ایک بڑا حصہ ابھی باقی تھا اور کسی بڑے شکار کے ہاتھ آجانے کی ابھی امید تھی۔ مگر مجھے مچان پر

بیٹھنے میں سخت تکلیف ہو رہی تھی اس لئے میں اور احمد مچان سے اُتر آئے۔ احمد نے سیٹی دی اور لالٹین روشن کی۔ وہ دونوں بھی آگئے۔ تینوں نے ملکر سانبھروں کو ذبح کیا اور اُسی وقت ہم سب کیمپ واپس آگئے۔ دِن نکلنے پر آدمیوں کو بھیجکر یہ شکار منگا لئے گئے۔

باب ساتواں

شیر کا شکار

جنگلوں اور پہاڑوں میں بہت سی مختلف جنگلی قومیں آباد ہیں، انکے جھونپڑے جنگلوں میں، دریا کے کنارے اور نیز جا بجا پانی کے اندر نظر آتے ہیں۔ خشکی پر بھی ان کے مکانات سطح زمین سے بلندی پر پائے جاتے ہیں اور ہر مکان اتنا وسیع ہوتا ہے کہ سو پچاس آدمی اُسمیں بہ آسانی رہ سکتے ہیں اور اسی لئے پوری بستی میں چند گھر ہوتے ہیں۔ بعض مقامات تو ایسے ہیں کہ وہاں صرف ایک ہی گھر ہے جس میں سب یکجائی طور پر رہتے ہیں۔ اُن جنگلی قوموں کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ

عموماً ننگے رہتے ہیں، صرف ستر پوشی کیلئے تھوڑا سا کپڑا یا چمڑا ہوتا ہے البتہ ان کے سروں پر تتوں کی بڑی سی ٹوپی ضرور ہوتی ہے۔ ان کی یہ اتحادی اور اتفاق کی زندگی قابلِ رشک ہے۔ کاش! ہم مہذب انسانوں کے لئے اسمیں کوئی بات قابلِ سبق ہوتی۔

افریقہ کی جنگلی قوموں کی طرح یہ لوگ خونخوار نہیں ہیں۔ نیزہ، ڈھال، تیر اور کمان ان کے ہتھیار ہیں، جن سے یہ ہر قسم کے جانور کو شکار کر کے آگ پر بھوننے کے بعد کھا جاتے ہیں۔ بورنیو کے وسطی حصہ میں کائن قوم کے جنگلی لوگ زیادہ تر پائے جاتے ہیں۔ ان کی بستیاں جا بجا ہیں۔ اکثر مقامات پر یہ دھان کی کاشت بھی کرتے ہیں، بعض لوہاری کے کام سے بھی کسی قدر واقف ہیں۔ ان کی باہمی بگانگت جہاں قابلِ تقلید ہے وہاں ان میں یہ سب سے بڑا عیب ہے کہ فرقہ وارانہ لڑائی ان میں عام ہے۔ ہمیشہ یہ قومیں ایک دوسرے سے برد آزما رہتی ہیں۔ سب قوموں کے سردار جدا جدا ہیں، اور یہ اپنے سرداروں کے بڑے ہی مطیع و فرماں بردار ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر یہ لوگ جمع ہو کر کچھ اپنی رسمیں بھی ادا کرتے ہیں۔ ان رسموں میں ایک یہ بھی ہے کہ بجائے دولھا کی طرف سے دولھن کے گھر بارات جانے کے یہ لوگ دولھا کے یہاں سے بارات لے جا کر دولھا کو بیاہ کر لے آتے ہیں۔

جب ہمارے کیمپ کو یہاں دو روز گذر گئے، تو قرب و جوار کے جنگلی لوگ ہمارے کیمپ میں آنے جانے لگے۔ تمام دن ان جنگلی مردوں اور عورتوں کا ہمارے کیمپ کے اردگرد ایک مجمع سا رہتا تھا جو محض تماشہ دیکھنے کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ عام طور پر ان کی خوراک گوشت ہے مچھلیاں بھی اکثر دریاؤں سے شکار کر لاتے ہیں۔ ان لوگوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس نواح کے جنگلوں میں سانبھر، ہرن، چیتا اور سؤر کے علاوہ اور کوئی بڑے جانور نہیں ہیں۔ اُن کی درخواست پر میں نے رائفل کی گولی سے ایک بڑا جنگلی سؤر اُن کے لئے شکار کر دیا جس سے وہ بہت ہی خوش ہو گئے اور اُس کو لکڑیوں میں باندھنے کے بعد کندھوں پر رکھکر اپنے گھر لے گئے۔

پانچ روز قیام کے بعد ہم نے یہاں سے کوچ کر دیا۔ اب ہمارا رُخ جنوب مشرق کی جانب تھا۔ جنگل اور دشوار گذار راستوں و گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے ہم تین روز سفر کرنے کے بعد ہم کوہ مولو کے جنوبی حصہ کے پہاڑوں کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ دریائے ٹنجا یہاں سے قریب ہی واقع تھا۔ ایک کھلے ہوئے سبزہ زار میدان میں کیمپ کر دیا گیا۔ یہ سب جنگل اور پہاڑ سارواک کے علاقہ میں شامل ہیں اور ڈچ علاقہ کی سرحد یہاں سے قریب ہی ہے، نیز کوہ کائرن کے بھی سلسلے یہاں سے کچھ دور

نہیں ہیں۔

اس وقت ہم تقریباً تین چار ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ موسم خوشگوار تھا اور گرمی نہ تھی۔ یہاں تمام رات ہمیں قریب ہی شیر اور چیتوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیا کیں جس سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ اس جنگل میں شیر اور چیتوں کی کمی نہیں ہے۔ یہاں پہنچکر یہ بھی معلوم ہوا کہ دریا کے قریب جنگلی بیل بھی ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب ہم اصل اور گھنے جنگلوں کے بالکل قریب پہنچگئے ہیں۔

دوسرے روز علی الصباح ہی جبکہ ابھی تاریکی ہی تھی قریب ہی جنگل میں سانبھر کے بولنے کی آواز آئی۔ احمد بندوق سنبھالکر اُس طرف روانہ ہوگیا اور تھوڑی دیر میں اُس کا شکار کر لایا۔

ناشتہ سے فارغ ہوکر میں نے تینوں شکاریوں کو اپنے ساتھ لیا اور ہم سب سامنے والے پہاڑ کی بلندی کو عبور کر کے اُس کی دوسری جانب پہنچگئے وہاں پہنچکر ہم نے نشیب میں دیکھا کہ درجنوں سیاہ بھالو درختوں اور جھاڑیوں سے لپٹے ہوئے پھل کھا رہے تھے۔ بورنیو کے شمالی حصہ میں جو ریچھ میں نے دیکھے تھے وہ قد و قامت میں اِن سے بہت چھوٹے تھے لیکن یہ تو اچھے خاصے طویل القامت تھے۔ میں نے تینوں شکاریوں کو دُور دُور کھڑا کر دیا تاکہ بہ یک وقت کئی کا شکار ہو سکے۔ لیکن اُن کے فائروں سے صرف تین ہی بھالو گر سکے بقیہ زخمی ہو کر بھاگ گئے۔ اور میرے قریب جو تھے اُن میں

سے بھی صرف نر ہاتھ آیا اور باقی جان لیکر فرار ہو گئے۔ اس طرح کل چار بھالوؤں کا شکار ہوا، جن کے چمڑے اُتار لئے گئے اور ہم کیمپ واپس آ گئے۔ یہ شکاری سب جانوروں کی کھالیں اور سینگ جمع کرتے جاتے تھے۔

دوسرے دن صبح ۸ بجے کے قریب ہم کیمپ میں بیٹھے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے کہ پاس ہی کے جنگل کے نشیبی حصہ سے بہت سے جانوروں کا شور اور سانبھر کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور احمدو جالو کو ساتھ لے کر اُس طرف کو روانہ ہو گیا۔ اسلام دو آدمیوں کو لے کر کھانے کے شکار کے لئے جا چکا تھا۔ پاؤ میل جنگل طے کرنے کے بعد بڑی جھاڑیوں میں کوئی جانور حرکت کرتا ہوا معلوم ہوا۔ ہم بہت ہی آہستہ آہستہ دبے پاؤں درختوں کی آڑ لئے ہوئے اُس کے قریب جا پہنچے اور اب ہم نے صاف طور پر دیکھ لیا کہ ایک شیر نے ایک مادہ سانبھر کا شکار کیا ہے اور اُس کے کھانے میں مصروف ہے۔ ہم اُس کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے اور اُس کی مصروفیت کا نظارہ کرتے رہے۔ وہ شیر ہندوستانی شیروں سے قد میں ضرور چھوٹا تھا لیکن خوبصورتی میں اُس کا درجہ کہیں بڑھا ہوا تھا۔

بورنیو کے جنگلوں میں شیر کو دیکھنے کا آج مجھے پہلا اتفاق تھا۔ وہ اپنے شکار کو کھانے میں اس درجہ محو تھا کہ ہماری موجودگی کا اُس کو قطعاً احساس

نہ ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے شکار کو کھانے میں مصروف تھا۔ آخر میں نے اُس کے سینہ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا لیکن فائر کرتے ہوئے میرے ہاتھ میں ذرا لغزش ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولی بجائے سینے کے پیٹ کے قریب پڑی۔ وہ گولی لگتے ہی اُچھلا اور گرجتا ہوا ہماری طرف لپکا۔ ابھی وہ فاصلہ ہی پر تھا کہ احمد نے اُس پر گراپ کا فائر کیا۔ جالو نے گولی چلائی۔ ہم اُس سے بلندی پر تھے اور اُس کو کسی طرح بھی زندہ اپنے تک نہ پہنچنے دیتے۔ بالآخر وہ زخمی ہو کر نیچے نالے میں کود گیا۔ ہم نے اُس کا تعاقب کیا اور خون کے نشانات دیکھتے ہوئے نصف میل تک جنگل میں چلے گئے۔ کچھ فاصلہ پر بید کی قسم کی بہت ہی گھنی جھاڑیاں تھیں جو دور تک چلی گئی تھیں۔ زخمی شیر انھیں جھاڑیوں میں جا کر گھس گیا۔ خیال گزرا کہ وہ زخمی بہت ہو چکا ہے، زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان گھنی جھاڑیوں میں انسان کا داخل ہونا آسان کام نہ تھا۔ انسان ان میں بیٹھ یا لیٹ کر ہی جا سکتا تھا۔ اب ہم عجیب کشمکش و پیچ میں تھے۔ اور ایسا شکار چھوڑا بھی نہیں جاتا تھا، اس لئے کہ اسی قسم کے شکار کے لئے جنگل کے سفر کی یہ تمام صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ پھر اس شکار کو کیوں ہاتھ سے جانے دیا جاتا۔ آخر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُسے حاصل کیا جائے۔

احمد کو میں نے ایک موقع کی جگہ پر کھڑا کر دیا کہ وہ اُس زخمی شیر کے

باہر نکلنے کی نگرانی کرتا رہے اور اگر وہ باہر نکل آئے تو اُس پر گولی چلا دے۔
جالو کو میں نے اپنے ساتھ لیا اور رائفل کا میگزین بھر لیا۔ جالو نے بھی
گراپ کے کارتوس بندوق میں ڈال لئے۔ اب ہم دونوں کہیں بیٹھ کر اور
کہیں لیٹ کر جھاڑیوں کے اندر خون کے نشانات دیکھتے ہوئے اُس کے
تعاقب میں چلے جا رہے تھے۔ اسی طرح بڑی مشکلوں سے ہم جھاڑیوں میں
پھنستے پھنساتے اندر بہت دُور تک چلے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے
دس بارہ گز کے فاصلہ پر ایک گہرا نالہ سا ہے۔ خیال ہوا کہ شیر اسی میں بیٹھ
گیا ہوگا۔ کیونکہ زخمی جانوروں کے لئے ایسی ہی جگہ جائے پناہ ہو سکتی ہے۔
یہاں تک آنے میں ہم تھک کر چکنا چُور ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر انتظار میں
گذارنے کے بعد چار پانچ گز میں اور آگے بڑھ گیا۔ میرے ساتھ ساتھ جالو
بھی تھا۔ یکایک نالے کے اندر میری نگاہ شیر کے سر پر جا پڑی۔ میں پانچ
منٹ تک برابر اُس کو دیکھا کیا۔ اُس میں ذرا بھی حرکت نہ پائی۔ خیال ہوا
کہ وہ یقینی مر چکا ہے۔ تاہم میں نے بہ نظرِ احتیاط اپنے سر کو کسی قدر بلند
کر کے زور سے ہُو کی آواز نکالی۔ اس آواز کو سنتے ہی اُس نے سر اُٹھا کر
میری جانب دیکھا اور ایک جست میں نالے سے باہر آ گیا۔ اب وہ ہم سے
صرف ۶ گز کے فاصلہ پر تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اگر درمیان میں جھاڑیاں
حائل نہ ہوتیں تو دوسری جست میں وہ ہم پر آ پڑتا۔ اُس کو اس قدر قریب

اور غضبناک حالت میں حملہ آور ہوتے ہوئے دیکھ کر ہم پر دہشت غالب ہو گئی اس لئے کہ ہم اپنی جگہ سے نہ تو ہٹ سکتے تھے اور نہ بھاگ سکتے تھے۔ میں نے اپنی اسی دہشت زدہ حالت میں حواس کو قائم رکھتے ہوئے اس کے نالے سے باہر آتے ہی اس کے سر پر فائر کر دیا۔ جالو نے بھی اس کے سر پر نشانہ لگایا۔ اس لئے کہ اس کا سر ہی ہمارے سامنے تھا۔ فائر کرتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا اور تھوڑی دیر کیلئے مجھے قطعی کچھ نہ معلوم ہوا کہ کیا ہوا۔ چند منٹ بعد جب میرے ہوش درست ہوئے تو میں نے دیکھا کہ شیر میرے سامنے گز بھر کے فاصلہ پر مردہ پڑا ہوا ہے۔ اپنی پشت کی جانب گھوم کر دیکھا تو جالو کو غائب پایا۔ وہ دہشت کے مارے جتنی جلدی ہو سکا جھاڑیوں سے باہر نکل گیا۔ اب میں یہاں سے پھر اسی طرح آہستہ آہستہ باہر واپس آیا۔ وہاں جالو اور احمد دونوں موجود تھے۔ جالو کو میں نے وہیں چھوڑ دیا اور احمد کو ساتھ لے کر میں کیمپ واپس آگیا۔ پھر احمد اپنے ساتھ کچھ آدمی اور رسّے لیکر وہاں دوبارہ گیا۔ ان سب نے مردہ شیر کو رسّے میں باندھ کر جھاڑی سے باہر نکالا اور پھر اٹھا کر کیمپ میں لے آئے، جہاں اس کی کھال اتار لی گئی۔

شام کے وقت کیمپ والے کھانا کھانے میں مصروف تھے اور احمد، اسلام اور جالو ہرن کا گوشت بھون رہے تھے۔ میں اپنی رائفل

اور عنایت کو ساتھ لے کر تھوڑی دور جنگل میں چلا گیا، وہاں ایک خشک نالے میں ہم کو کسی جانور کی موجودگی کا شبہہ ہوا، چنانچہ ہم اسی جگہ ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو ہم نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی خوبصورت چیتا (گلدار) نیچے سے کود کر اوپر آیا اور ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ جھک کر نیچے کی جانب کسی چیز کو دیکھ رہا تھا میں نے اس پر فائر کرنے کے لئے رائفل اٹھائی۔ عنایت نے کہا کہ یہ نیچے کی طرف بار بار کیا دیکھتا ہے۔ میں نے درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس چیتے کے دو چھوٹے بچے آپس میں بلی کے بچوں کی طرح کھیل رہے ہیں اور یہ ان کی ماں ہے جو انھیں محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے اور خوش ہو رہی ہے۔ میرے لئے یہ نظارہ نہایت دلکش تھا، اور ماں کی ممتا کا ایک دلچسپ سین میرے پیش نظر تھا۔ میں نے ان بچوں کی خاطر ان کی ماں پر گولی چلانے سے ہاتھ روک لیا اور کیمپ واپس آگیا۔

باب آٹھواں

جنگلی بیل کا حملہ

دوسرے روز ہمارے شکار کا پروگرام وزادور کا تھا۔ عنایت اور تینوں شکاری میرے ہمراہ تھے۔ ناشتہ اور کھانا لے چلنے کے لئے دو آدمی اور ساتھ لے لئے۔ تین میل پاپیادہ سفر طے کر کے ہم جنگلیوں کی ایک بستی میں پہنچے۔ وہاں تھوڑی دیر قیام کر کے ہم نے ناشتہ کیا اور پھر روانہ ہو گئے۔ ہرن اور ریچھ وغیرہ جانوروں کی جانب ہم نے مطلق توجہ نہیں کی جو راہ میں برابر ہمیں ملا کئے۔ ہم کو اس بات کا بڑا خوف لگا ہوا تھا کہ کہیں راستہ میں اورنگ اوٹن (بن مانس) کا سامنا نہ ہو جائے۔ بیبون بندروں کا خوف لگا ہوا تھا، جو اس جنگل میں موجود ہیں۔ اس وقت ہمارے مدنظر صرف جنگلی بیلوں کا شکار تھا، جن کی نسبت ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ اس جنگل میں دریا کے کنارے رہا کرتے ہیں اور بکثرت ہیں۔

دس بجے کے قریب ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ اس مقام پر جنگل نہایت گھنا تھا اور لمبی لمبی گھاسیں لہرا رہی تھیں، جا بجا انھیں گھاسوں میں پانی بھی بہ رہا تھا۔ سارا واک کے جنگلوں میں جنگلی بیل کے شکار کا

خیال مجھے عرصہ سے تھا، یہ ایک نیا شکار تھا۔ میں نے عنایت، جالو اور دونوں قلیوں کو ایک بلند مقام پر پتھروں کی اوٹ میں بٹھا دیا تاکہ جالو دُور تک نظر دوڑا کر شکار کا خیال رکھے اور سیٹی سے ہم کو باخبر کر دے۔

میں احمد اور اسلام کو ساتھ لے کر آگے بڑھا، یہ دونوں بہت عمدہ شکاری تھے۔ میں ان کو لے کر جنگل میں گھس گیا۔ لمبی گھاس کے اندر کچھ دور تک پانی کو طے کرتے ہوئے ہم ایک خشک اور بلند جگہ پر پہنچے۔ یہ جگہ شکار کے لئے نہایت موزوں تھی۔ دریا کے کنارے دُور تک نظر کام کرتی تھی۔ دونوں طرف کے جنگل ہماری نظر کے سامنے تھے۔ وہاں ہم درختوں کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ ۱۲ بجے کے قریب مجھے کچھ بھوک معلوم ہوئی، ناشتہ موجود تھا۔ تھوڑا سا کھایا اور ابھی کھا ہی رہا تھا کہ احمد نے مجھے اشارہ سے اپنے پاس بلایا، جو ہم سے تھوڑی دور پر کھڑا ہو کر شکار کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا، تو اُس نے انگلی کے اشارہ سے مجھے بتایا کہ وہ بیل آ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر ایک بڑا جانور گھاس کو اپنے سینگوں سے چیرتا ہوا ادھر کو آ رہا ہے۔ اُس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا، تقریباً آدھ گھنٹے میں وہ ہمارے قریب پہنچا۔ جب ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر آ گیا تو میری نگاہ اُس پر پڑی۔ رنگ تھوڑا سفیدی مائل

تھا۔ سینگ لمبے اور پھیلے ہوئے تھے۔ قد بڑا اور جسم خوب لمبا چوڑا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سُرخ دُور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔ تھا تو وہ بیل ہی مگر اُس کی صورت بڑی ہی ہیبتناک تھی۔ میں درخت کی اوٹ میں رائفل لئے ہوئے فائر کرنے کے لئے بالکل تیار تھا اور صرف اُس کے اور قریب آجانے کا منتظر تھا۔ جب وہ ستّر گز کے فاصلہ پر آگیا تو میں نے اطمینان کے ساتھ اُس کے اگلے حصّے پر گولی لگائی۔ گولی لگتے ہی وہ تین چار مرتبہ اُچھلا کُودا اور پھر ایک طرف کو بھاگا۔ اُس کی اُچھل کود میں دوسرا فائر نہ کر سکا۔

احمد کی رائے تھی کہ جنگل بہت گھنا ہے اور اس میں گھسنا آسان نہیں ہے اس لئے اُس کا تعاقب نہ کیا جائے اور چھوڑ دیا جائے، لیکن میں نے اصرار کیا کہ کچھ دور تک اُس کو ضرور تلاش کر لینا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ قریب ہی مل جائے۔ چنانچہ پہلے ہم اُس مقام پر گئے جہاں بیل پر گولی چلائی تھی اور وہاں سے خون کے نشان پر جو جا بجا گھاس میں تھے ہم دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ راستہ خراب و دشوار گذار ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل کے ساتھ تھوڑا فاصلہ طے کیا۔ یہ خون کے نشان جھاڑیوں کے اندر ایک طرف کو چلے گئے تھے اور بیل کے پیروں کے نشانات بھی تازہ تھے۔ ہم وہاں کچھ فاصلہ پر رُک گئے ہم کو

جنگلی بیل کا شکا

یقین ہوگیا کہ وہ زخم کی وجہ سے انھیں جھاڑیوں میں گھس کر بیٹھ گیا ہے۔
میں دونوں شکاریوں سے ذرا آگے بڑھ کر کھڑا تھا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد
میں نے احمد سے کہا کہ ان جھاڑیوں میں ایک فائر گراپ کا کرو۔ اُس کے
فائر کرتے ہی زخمی بیل جھنجھلا کر ایکدم جھاڑیوں سے نکلکر باہر ہمارے سامنے
آگیا۔ میں بالکل اُس کے زد میں صرف چند گز کے فاصلہ پر تھا۔ اُسکی
سُرخ اور غضبناک آنکھیں غصّے میں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے فائر
کرنے کے لئے فوراً رائفل اُٹھالی۔ مگر اللہ اللہ وہ اس تیزی و تُندی سے
ہماری طرف جھپٹا کہ ہم تینوں میں سے کسی ایک کو بھی اُس پر فائر کرنے کا
موقع نہ مِلا۔

آناً فاناً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے بجلی کوند گئی۔ بیل مجھ پر
آرہا اور اُس نے مجھ کو اپنی سینگوں پر اُٹھا کر دس پندرہ گز دور بعینہٖ
فٹ بال کی طرح اُچھال کر پھینک دیا۔ میرے پیر۔ کمر اور سر میں
اس قدر چوٹ آئی کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ دونوں شکاریوں نے
معاً گولیوں کے چار فائر کئے اور بیل گر پڑا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ تقریباً دو یا تین بجے کا وقت تھا کہ مجھے ذرا
ہوش آیا اور میری آنکھ کھلی۔ میں نے اپنے آپ کو جنگل میں ایک کھلی
جگہ پڑے ہوئے پایا اور دیکھا کہ عنایت میرے سرھانے بیٹھا میرے

سر کے زخم سے خون صاف کر رہا ہے۔ میرے سر، ٹانگ اور کمر میں سخت درد تھا۔ کپڑے خون سے تر ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھکر بیٹھ گیا۔ اپنے سب ساتھیوں کو میں نے موجود پایا۔ زخموں سے اب خون بند تھا۔ مگر طبیعت بہت نڈھال تھی۔ احمد اور اسلام نے مجھے بتلایا کہ بیل نے آپ کو اٹھا کر دُور گھاس اور کیچر میں پھینک دیا تھا۔ رائفل آپ کے ہاتھ سے گر گئی تھی اور قبل اس کے کہ بیل ہم پر یا آپ پر دوبارہ حملہ کرتا ہم نے ٹھوس گولیوں کے مسلسل چار فائر اُس کے سر اور سینہ پر کئے جس سے وہ فوراً گر کر ختم ہو گیا۔ اُس کے بعد ہم آپ کو یہاں اُٹھا کر لے آئے اور خطرہ کی سیٹی بجا کر جالو اور اِن سب کو یہاں بُلا لیا۔ یہ سب لوگ ہمارے پاس فوراً آ گئے۔

میں نے پانی منگوایا۔ تھوڑا سا پیا اور منہ دھویا۔ گو مجھے اس وقت تکلیف بہت تھی مگر چونکہ شام قریب ہوتی جا رہی تھی اور جنگل کا واسطہ تھا اس لئے ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں احمد اور عنایت کے کندھوں کا سہارا لئے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا، آخر بہ دشواری ہم سب غروبِ آفتاب سے قبل جنگلیوں کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ اپنے کیمپ تک پہنچنے کی مجھ میں توانائی نہ تھی، اس کے علاوہ اب نا وقت بھی ہو چکا تھا اس لئے ہم رات کو اسی گاؤں میں ٹھہرنے پر مجبور تھے۔ جنگلی لوگوں نے

اپنے جھونپڑے کا ایک حصہ ہمارے لئے خالی کر دیا، جہاں مجھے آرام سے ایک جگہ لٹا دیا گیا۔ بستی کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بیل کا شکار کیا جا چکا ہے اور وہ مُردہ حالت میں جنگل میں پڑا ہے تو بستی کے بیس تیس آدمی چند مشعلیں ساتھ لیکر اُسی وقت جنگل کی جانب روانہ ہو گئے اور وہاں اُس کو تلاش کر کے بڑے بڑے ٹکڑے کرنے کے بعد اُٹھا لائے۔

میں رات بھر درد کی تکلیف سے بے چین رہا۔ میری ٹانگوں میں سب سے زیادہ تکلیف تھی۔ دوسرے دن صبح گرم پانی سے زخم کو صاف کر کے اُن پر کپڑے کی پٹیاں باندھ دی گئیں۔ پھر میں نے تھوڑا سا ناشتہ کیا اور اس کے بعد سب کو لے کر آہستہ آہستہ سہارا لیتا ہوا کیمپ کی جانب روانہ ہو گیا۔ الغرض تین میل کا فاصلہ بمشکل تین گھنٹے میں طے کر کے ہم کیمپ میں پہنچے۔ احمد نے کچھ جنگلی پتّے کوٹ کر میرے زخموں پر باندھ دیئے میں زیادہ زخمی ہو جانے کی وجہ سے تکلیف میں تھا، اس لئے کئی دنوں کے لئے بیکار ہو کر بستر پر پڑ گیا۔

عنایت روزانہ زخموں کو دھو کر تازہ پتّے باندھ دیا کرتا تھا۔ زخم اچھے ہونے لگے۔ مجھے اپنی حالت پر اس لئے زیادہ افسوس تھا کہ عین شکار کے ایّام میں میں صاحب فراش ہو گیا اور مجھے بستر پر پڑے رہنا سخت شاق گذر رہا تھا۔

تیسرے روز صبح کو میں نے تینوں شکاریوں کو اپنے پاس بُلوایا اور اُن سے کہا کہ میں اپنی مجبوریوں کے باعث ابھی چند دنوں جنگل میں جانے کے قابل نہیں ہوں تم لوگ میری وجہ سے بیکار ہو کر نہ بیٹھ جاؤ اور اُسی جنگل میں پھر جاؤ جہاں بیل مارا گیا تھا اور وہاں جا کر ایک رات گذارو، میرا خیال ہے کہ تمھیں وہاں ضرور شیر اور چیتے پر گولی چلانے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ رات کے ابتدائی حصہ میں تم چاند کی روشنی سے بھی خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکو گے اور تمھیں اس امر کا علم بخوبی ہے کہ وہاں شیر اور چیتے بہ کثرت ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ میرے کہنے کے بموجب دس بجے کے قریب کھانے سے فارغ ہو کر ایک قلی کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ میں نے دن بھر تنہائی میں بسر کیا۔ صرف عنایت میرے پاس موجود تھا۔

شام کے وقت میں نے دیکھا کہ سامنے والے پہاڑ سے چار جنگلی آدمی اُتر کر ہمارے کیمپ کی طرف آرہے ہیں۔ میں نے اُنھیں اپنے پاس بُلا لیا اور چاہا کہ باہر بیٹھ کر ان سے باتوں میں کچھ وقت گذاروں۔ چنانچہ عنایت سے کہہ کر میں نے اپنے بیٹھنے کے لئے دری بچھوائی، جس پر مجھے تکیوں کا سہارا دے کر بٹھا دیا گیا۔ وہ چاروں جنگلی اپنے نیزے زمین پر گاڑ کر اور ڈھالیں اُن میں لٹکا کر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ دو آدمی ہمارے کیمپ سے آگئے جو اُن کی زبان سمجھتے تھے۔ مگر یہ جنگلی ملائی نہ بول سکتے تھے۔ ستر پوشی

کے لحاظ سے ان کے جسم پر تھوڑا سا کپڑا تھا جس کی وہ غرقی باندھے ہوئے تھے اور سر پر پتوں کی ہیٹ تھی۔ گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ کائن قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تین چار جنگلی قوموں کے نام انھوں نے اور بھی بتلائے جو انھیں جنگلوں میں آباد ہیں۔ لیکن یہاں سب سے زیادہ آبادی انھیں کائن لوگوں کی ہے، جو ملک کے وسطی حصہ میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے استفسار پر انھوں نے بیان کیا کہ ہماری قوم خونخوار نہیں ہے اور نہ وہ کسی کو بلا وجہ لوٹتی مارتی ہے۔ البتہ ہم لوگوں پر جب دوسری قوم کے لوگ حملہ کرتے اور دق کرتے ہیں تو ہم بھی اُن سے بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے کہا کہ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا یہاں سے دس کوس کے فاصلہ پر کیلی قوم کے لوگوں کی ایک بستی ہے وہ لوگ رات کے وقت ہمارے گاؤں میں گھس آئے اور دو نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ جب ہمارے سردار کو یہ معلوم ہوا اور معاملہ کی تحقیقات بھی ہو گئی تو سردار نے ہم سب کو لڑائی کی تیاری کا حکم دیدیا اور ہم سب کو لیکر روانہ ہو گئے۔ وہ لوگ بھی اپنے سردار کی معیت میں لڑائی کے لئے تیار تھے۔ دو روز تک بڑی خون ریز لڑائی ہوتی رہی۔ دونوں طرف کے بہت سے آدمی کام آئے اور زخمی ہوئے۔ بالآخر وہ لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے۔ ہم نے اُن کے گاؤں کو لوٹا اور گھر

جلادیئے اور دونوں لڑکیاں واپس لے آئے۔ نیز یہ بھی بیان کیا کہ یہ کیلی قوم کے لوگ نہایت ہی کمینے اور بدمعاش ہیں اور ان کا سردار بھی جاہل آدمی ہے۔

غروب آفتاب کے بعد یہ لوگ واپس چلے گئے۔ میں نے کھانا کھایا، کافی پی اور اپنے بستر پر جاکر لیٹ گیا۔ خیمہ کے دروازہ پر لالٹین روشن تھی۔ میرے قریب ہی عنایت کا بستر تھا۔ میں لیٹتے ہی گہرے خیالات میں ڈوب گیا۔ اس وقت میرے دل میں ان خیالات سے بہت صدمہ ہو رہا تھا کہ میرا پروگرام تو جلد سے جلد امریکہ پہنچنے کا تھا اور اب تک وہاں پہنچکر مجھے کسی ڈنیل کالج میں داخل ہو جانا چاہیئے تھا مگر افسوس کہ میں یہاں بورنیو کے جنگلوں ہی میں الجھکر رہ گیا ہوں۔ میری اصل اسکیم ابھی تک کامیاب نہ تھی بلکہ کچھ اور بھی دور ہو گئی تھی۔ میں دیر تک اسی افسوس اور خیال میں مبتلا رہا اور اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اب مجھے جلد سنڈیکن واپس چلے جانا چاہیئے اور وہاں پہنچکر امریکن قونصل سے فلپائن میں داخلہ کے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سنڈیکن بنک میں اس وقت میرے حساب میں دو ہزار روپئے سے زائد جمع تھے اور مال بھی چار پانچ سو روپئے کا موجود تھا۔ اب یہی فکر دامنگیر ہوئی کہ کسی طرح جلد سے جلد بورنیو کو خیرباد کہہ کر فلپائن پہنچ جاؤں اور وہاں

تجارت کے ذریعہ سے روپیہ بڑھانے کی کوشش کروں۔ اس کے بعد میں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ اب دو ہی چار دنوں میں یہاں سے کوچ کرکے برونی واپس چلا جاؤں اور شکار کا سلسلہ اب بند کردیا جائے۔

مگر انسان کی ہستی بہت مجبور اور بے بس ہے۔ انسان اپنے طور پر بہت کچھ کرنا چاہتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو کچھ خدا کو منظور ہو۔

میں اس وقت پڑا ہوا دل ہی دل میں یہاں سے جلد واپسی اور نیز فلپائن میں داخلہ کے متعلق منصوبے باندھ رہا تھا ——... مگر تقدیر میرے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ ابھی تمہارے لئے انھیں جنگلوں میں بہت سی تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے یا ابھی ان جنگلوں میں اور سختیاں و تکالیف اٹھانی باقی ہیں۔

الغرض میں انھیں خیالات میں غرق تھا کہ رات کے گیارہ بج گئے۔ میرے پاس ہی عنایت پڑا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ کیمپ کے سب لوگ بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہے تھے۔ چاروں طرف جنگل میں ایک سناٹے کا عالم تھا۔ چاند کی ۸ یا ۹ تاریخ تھی اور ہنوز چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی خیال آرائیوں کی بدولت نیند نہیں آرہی تھی کہ یکایک قریب کے پہاڑ سے شیر کے بولنے کی آواز سنائی

دی۔ اُس کی گرج نے رات کے سناٹے میں پہاڑ اور اُس کے مرغزار میں گونج کر ایک دہشت و ہیبت پیدا کر دی۔ اُس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہاڑ سے اُتر کر نیچے کیمپ کی طرف آ رہا ہے۔ میرے لئے اس وقت یہی فکر کی بات تھی ورنہ یوں تو یہاں روزانہ شیر کی آواز سُنا کرتا تھا۔ مجھے اس امر کا اندیشہ تھا کہ کہیں وہ ہمارے گھوڑوں پر حملہ نہ کر دے جو باہر کھلے میدان میں بندھے ہوئے ہیں۔ میں خود اُٹھ کر باہر جانے کے قابل نہ تھا اور میرے کوئی شکاری بھی کیمپ میں موجود نہ تھے۔ شیر اب خاموش تھا۔ اُس کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔ شیر کا ہر جگہ یہ خاصّہ ہے کہ وہ اپنی مار کے قریب خاموش ہو جایا کرتا ہے اور اسی خاموشی ہی کی حالت میں وہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اُس کی اس خاموشی نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ ضرور گھوڑوں پر حملہ کرے گا۔ میں اسی خیال سے عنایت کو جگا ہی رہا تھا کہ اتنے میں یکایک شور و غل ہوا، گھوڑوں کی بھاگ دوڑ کی آوازیں سُنائی دیں اور کیمپ والے سب جاگ اُٹھے اور اپنے نیزے اور لالٹینیں لئے ہوئے باہر دوڑ پڑے۔ اس شور و ہنگامہ پر شیر جنگل میں جا رہا۔ عنایت باہر گیا اور وہاں سے آ کر اُس نے خبر دی کہ شیر نے ایک باربرداری کے گھوڑے پر حملہ کر کے اُس کی گردن توڑ ڈالی اور خون پیکر فرار ہو گیا۔ اس خبر

سے مجھے بہت تکلیف ہوئی اور دیر تک اپنی بے بسی و بے چارگی پر افسوس کرتا رہا، اس لئے کہ میں اپنے زخموں کی مجبوری کی وجہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ایک گھوڑے کے ضائع جانے کے بعد کیمپ والے ہوشیار ہو گئے اور رات کو باری باری سے جاگتے رہے۔

دوسرے روز دوپہر تک مجھے اپنے شکاریوں کی واپسی کا انتظار تھا۔ خیال تھا کہ دوپہر تک وہ ضرور واپس آجائیں گے، لیکن وہ شام تک بھی نہ آئے جس سے خیال پیدا ہوا کہ شاید وہ دور چلے گئے۔ تمام رات مجھے اُن کے انتظار میں بے چینی رہی۔ آخر تیسرے دن صبح ۹ بجے کے قریب کچھ لوگوں کی آمد کا ہنگامہ سنائی دیا۔ میں چھڑی کے سہارے اُٹھ کر باہر گیا اور وہاں جا کر جو کچھ میں نے دیکھا اُس سے مجھ پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ تین قلی ایک زخمی کو کندھوں پر اُٹھائے ہوئے لا رہے ہیں۔ احمد اور جالو ساتھ ہیں۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ اسلام سخت زخمی ہے۔ اُس کا چہرہ، سر، گردن اور بازو سب زخموں سے چُور ہیں۔ اُس کی چھولداری میں اُس کو لٹا دیا گیا۔ زخموں کی مرہم پٹی کی گئی۔ ذرا ہوش آنے پر اُس کو شوربا پلایا گیا۔ اُدھر سے فارغ ہو کر احمد میرے پاس آیا اور اُس نے اپنے شکار کے واقعات یوں بیان کئے۔

باب نواں

کیلی جنگلیوں کا کیمپ پر حملہ

احمد نے بیان کیا کہ پرسوں ہم یہاں سے روانہ ہو کر تین میل پر اسی گانوں میں پہنچے، جہاں آپ نے رات بسر کی تھی۔ وہاں گانوں والوں کی زبانی ہم کو معلوم ہوا کہ سامنے بلند پہاڑوں کے اس پار وسیع جنگل ہیں، وہاں شیر اور درندے اس کثرت سے ہیں کہ ان کا شکار دن کے وقت بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم اس پہاڑ کو طے کر کے تقریباً چھ سات کوس دور جنگل میں پہنچ گئے۔ وہاں سانبھر بکثرت تھے۔ اسلام نے ایک سانبھر پر گولی چلائی۔ وہ گرا۔ ہم نے ذبح کیا اور گوشت کا کچھ حصہ کاٹ کر قریب کے ایک چشمہ پر لے آئے۔ اسی کے کنارے ہم خشک لکڑیاں جمع کر کے گوشت بھوننے میں مصروف تھے کہ دو جنگلی ہمارے پاس آئے اور انھوں نے ہم سے گوشت مانگا۔ ہم نے جواب دیا کہ وہ سامنے جانور پڑا ہوا ہے تم کو جس قدر گوشت کی ضرورت ہو لے جاؤ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کیلی قوم کے لوگ ہیں اور تین کوس کے فاصلہ پر

ان لوگوں کی بستی ہے۔ وہ دونوں جنگلی شکار کا گوشت اُٹھا کر لے گئے شام ہوگئی تھی ہم نے اُسی چشمے کے کنارے درختوں پر مچان بنا کر رات بسر کرنے کی تجویز کی۔ دو مچان بنائے گئے ایک پر اسلام اور جالو پہنچ گئے، دوسرے پر میں نے قلی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

رات کا بڑا حصّہ گزر جانے کے بعد ہر طرف جنگل میں شیروں اور دوسرے درندوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ درندے رات کو کسی وقت چشمے پر پانی پینے کے لئے ضرور آئیں گے۔ چشمے کے کنارے شیروں اور دیگر درندوں کے پانوں کے نشانات موجود تھے۔ آدھی رات کے قریب جنگل میں یکایک کسی جانور کے چیخنے کی ہیبتناک آواز سنائی دی، جس سے ہم خوف زدہ ہوگئے۔ یہ آواز اورنگ اوٹن کی تھی اور قریب ہی معلوم ہوتی تھی۔ ہم کو اندیشہ ہوا کہ خدانخواستہ کہیں اُس کو ہماری یہاں موجودگی کا علم نہ ہو جائے ورنہ ہمارے لئے مشکلوں کا سامنا ہو جائے گا۔ اُس کی مہیب و کرخت آواز سے تمام جنگل میں سناٹا چھا گیا۔ شیروں کی آواز بند ہوگئی آدھ گھنٹے تک وہ بولتا رہا، اور دُور چلا گیا۔ پھر سارے جنگل پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ہم سب جاگتے رہے۔ دو گھنٹے گذر جانے کے بعد اچانک ایک طرف سے ایک شیر چشمے پر آ کھڑا ہوا۔ تھوڑا سا

پانی پیا، پھر منہ اٹھا کر سامنے دیکھتا رہا۔ اسی حالت میں اس نے ایک مرتبہ گھوم کر زور سے دھاڑا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ سامنے کی جانب سے دو۲ شیر ایک نر، دوسرا مادہ اور ان کے ساتھ دو۲ بچے چشمے کے دوسرے کنارے پر آکر پانی پینے لگے۔ چشمہ بڑا تھا۔ دونوں شیر آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، اور غرّاتے رہے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد پہلا شیر چشمہ کے کنارے کنارے ہو کر دوسرے شیر کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں کچھ دیر غرّاتے اور گرجتے رہے، پھر باہم باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ آدھ گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی۔

اس کے بعد ہم لوگوں میں ہلکی سیٹی کے اشارے ہوئے اور فوراً ہی ڈَن......ڈَن..... چھ فائر ہوئے۔ تینوں شیر سخت زخمی ہو کر ادھر ادھر قریب ہی گر گئے۔ دونوں بچے اپنی مُردہ ماں کے قریب بیٹھے رہے۔ ہم صبح کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے صبح کی روشنی ظاہر ہوئی۔ ہم نے درختوں کی بلندی پر سے دیکھ کر اس امر کا اطمینان کر لیا کہ تینوں شیر مر چکے ہیں۔ جب ہم درختوں سے اُن کے قریب گئے تو ہم کو دیکھ کر دونوں بچے دور بھاگ گئے۔ ہم اُن کو پکڑنے کے لئے دوڑے ہماری بیحد کوششوں کے باوجود وہ دونوں ہمارے قابو میں نہ آئے۔ دو۲ تین گھنٹے اسی دوڑ دھوپ میں صرف ہو گئے، اور

ہم تھک گئے۔ بھوک کا غلبہ تھا، ہم نے ایک ہرن شکار کر لیا، اسکو اُٹھا کر چشمے پر لے آئے اور اُس کے گوشت کو صاف کر کے بھونا ابھی ہم کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ وہی دونوں جنگلی کیلی پھر آگئے جو گذشتہ شام کو آکر شکار کا گوشت لے گئے تھے۔

آتے ہی شیروں کو مُردہ دیکھ کر غضبناک ہو گئے اور ہم سے باز پُرس کرنے لگے، کہ تم لوگوں نے ہمارے جنگل کے یہ جانور کیوں مارے ہیں؟ ہم تم لوگوں کو پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لیجا ئینگے۔ یہ کہتے ہی وہ ایک بندوق اُٹھا کر لے بھاگے۔ میں نے فوراً دوسری بندوق اُٹھائی۔ اُس میں ایک طرف گولی اور دوسری طرف گراپ لگے ہوئے تھے۔ میں نے گولی اُس پر چلائی جو بندوق لے کر بھاگا تھا اور گراپ دوسرے پر لگائے۔ گولی کے لگتے ہی وہ جنگلی گرا، اور ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر دوسرا گراپ کھا کر زخمی ہو گیا، اور بھاگا۔ میں نے دوبارہ اُس پر گولی چلائی، مگر وہ نکل گیا۔ بندوق جنگلی سے حاصل کی۔ اب ہمیں یہ فکر لاحق ہوئی، کہ اُس جنگلی کا زندہ بچکر بھاگ جانا بہت ہی بُرا ہوا وہ اپنے گانوں میں پہنچکر قیامت برپا کر دے گا، اور بہت سے جنگلی ہم کو آکر گھیر لیں گے اور زندہ نہ جانے دیں گے۔ یہ ہم کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ کیلی لوگ نہایت بدمعاش ہیں۔ چنانچہ اسی تردد اور فکر

میں ہم نے مجبوراً شیروں کی کھالیں اُتار لینے کے ارادہ کو ترک کر دیا، اور اُن کو بجنسہٖ اُسی حالت میں چھوڑ کر ہم چاروں آدمی واپسی کے قصد سے جنگل ہی جنگل چل دیئے۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ ہم گھنے جنگل میں تیز قدمی سے جا رہے تھے۔ جنگل میں ٹھیک راستہ کا اندازہ کرنا کیسا کچھ دشوار ہے، مگر ہم اپنے اندازے سے ٹھیک سمت پر چل رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کامل چلنے کے بعد گھنا جنگل اور بلند پہاڑ ہمارے سامنے آگیا۔ ہم کو خیال ہوا کہ شائد ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ مگر آگے بڑھے چلنے کے لئے مجبور تھے۔ ہم قدم بڑھائے آگے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک مہیب اور خوفناک آواز نے ہم سب کے دل دہلا دیئے۔ ہم سب کی نگاہیں خوف و ہراس سے اُس جانب اُٹھ گئیں۔ سامنے کے درخت پر شور تھا۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ ہم سخت خطرہ میں ہیں۔ اور ایک بہت بڑا اورنگ اوٹن درختوں پر اُچھلتا کودتا اوپر ہی اوپر اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ ہم درخت کی آڑیں کھڑے ہو گئے اور بندوقیں تیار کر لیں۔ وہ بن مانس ہمارے سامنے درخت پر پہنچکر زور سے چیخا۔ قبل اس کے کہ وہ درخت سے ہمارے اوپر کود ے، ہم نے اُس پر فوراً ایک ساتھ چھ فائر کر دیئے۔ اُس کا سر، سینہ اور گردن سب

زخمی ہو گئے۔ اگر کوئی دوسرا جانور اس کی جگہ ہوتا تو اتنی مار کے بعد فوراً گر کر ٹھنڈا ہو جاتا۔ مگر یہ سخت جان چھ گولیاں کھا لینے کے بعد بھی تندرست تھا۔ اُس نے فوراً ہی ایک چھلانگ ماری اور کود کر اسلام کو پکڑ لیا اور غصے میں اسلام کے بازو۔ کمر۔ سر اور گردن چبا ڈالے اور بُری طرح زخمی کرنے کے بعد اُس کو اُٹھا کر لے بھاگا۔ میں نے معاً اُس کے پیروں پر دو فائر کر اپ کے کئے۔ ان فائروں کے اثر سے وہ تھوڑی دور جا کر گر گیا۔ ہم فوراً اُسکے پاس پہنچے۔ وہ اب تک زندہ تھا مگر اُٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ میں نے اُس کے دماغ پر ایک فائر اور کر دیا جس کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم تینوں آدمیوں نے ملکر اسلام کو اُٹھا لیا اور آہستہ آہستہ آگے روانہ ہوئے۔ بمشکل تمام غروب آفتاب کے قریب ہم اُس گاؤں میں پہنچے جہاں سے دریافت حال کے بعد ہم روانہ ہوئے تھے۔ رات اسی بستی میں گذاری۔ آج صبح دو آدمی وہاں سے لئے اور ایک آدمی ہمارے ساتھ ہی تھا اُنھیں تینوں سے اسلام کو اُٹھا کر یہاں تک لے آئے ہیں۔

احمد کی زبانی یہ تمام حالات سُنکر مجھے بڑی پریشانی ہو گئی اور دو باتوں کی فکریں لاحق ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام کی حالت زیادہ خراب ہے اُسکے بچنے کی اُمید بہت کم ہے اگر وہ مر گیا تو میں سلطان بروئی کو کیا جواب دوں گا اور خدا معلوم وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں اور دوسرے اس امر کا اندیشہ

تھا کہ ان جنگلی قوموں میں انتقام کا جذبہ بہت زیادہ ہے، وہ اپنا انتقام بلا لئے ہوئے باز نہیں آتے۔ ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں کیلی قوم کے ایک آدمی مارا جانا اور دوسرے کا زخمی ہو کر بھاگ جانا نہایت ہی بُرا ہوا۔ بلکہ اگر وہ زخمی آدمی بھی مرجاتا تو بہتر ہوتا کیونکہ اُن کی قوم کو اس حادثہ کی جلد خبر نہ ہوتی اور اُن کے مطلع ہونے تک ہم یہاں سے کوچ کر جاتے اور کوئی فتنہ نہ اُٹھنے پاتا۔ اس کے علاوہ اگر یہ صورت نہ پیش آتی تو اسلام کو بھی اس مصیبت اور تکلیف سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ سب سے زیادہ اس وقت مجھے اسی امر کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مبادا کیلی جنگلیوں کی فوجیں ہمارے کیمپ پر دھاوا نہ بول دیں اور اگر بالفرض ہم یہاں سے اسی وقت روانہ بھی ہو جائیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ ہمیں راہ میں گھیر کر ہم پر حملہ کر بیٹھیں۔ وہ آزاد لوگ ہیں، انھیں کسی کا خوف و خطر تو ہے نہیں، وہ ہمیں زندہ کیوں جانے دیں گے؟ میری حالت خود تو اب ضرور اس قابل تھی کہ میں گھوڑے پر سوار ہو سکوں اور سب کو لے کر روانہ ہو جاؤں۔ مگر اسلام کی حالت ایسی نہ تھی کہ سفر کیا جائے غرض انھیں پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ نہ جائے ماندن تھی اور نہ پائے رفتن

شام کو اسلام کے دیکھنے کے لئے میں پھر گیا، اُس کی حالت خراب تھی اور وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ سارا جسم نیلا ہو گیا تھا، اس لئے کہ بن مانس کے کاٹنے کا زہر پورا اثر کر چکا تھا اور سارا بدن ورم کر آیا تھا۔

رات بھر وہ بہت بے چین رہا اور دوسرے دن صبح ۹ بجے کے قریب اُس کا انتقال ہوگیا۔ ہم سب کو انتہائی صدمہ ہوا۔ اُس کو غسل دیا گیا اور اُس کے بستر کی چادر سے کفن کا کام لے کر قریب ہی دامن کوہ میں قبر کھود کر زمین کے سپرد کر دیا گیا۔ دو بجے کے قریب ہم سب نے اس سے فراغت پائی۔ میں نے بادلِ ناخواستہ تھوڑا سا ناشتہ کیا، کافی پی اور احمد سے اسی وقت یہاں سے کوچ کر دینے کو کہا، لیکن احمد نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ روانگی کو کل صبح پر ملتوی رکھیئے تاکہ تمام دن چلکر ہم شام کو کسی مناسب مقام پر قیام کر سکیں۔

میں خیمے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا، تکان کی وجہ سے نیند آگئی۔ پانچ بجے شام کے قریب لوگوں کے شور و غل سے میری آنکھ کھل گئی، گھبرا کر باہر آیا تو ایک قیامت خیز ہنگامہ پایا۔ عنایت بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور چلا کر کہنے لگا کہ غضب ہوگیا، اب ہم سب زندہ نہیں بچ سکتے۔ بے حساب جنگلیوں نے جا کے کیمپ کا محاصرہ کر کے حملہ کر دیا ہے۔ وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا مسلسل بندوق کے فائروں کی آوازیں آئیں جو احمد اور جالو نے اُن جنگلیوں پر کئے تھے جس کے بعد جنگلیوں نے اپنے شور و غل سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

میں نے عجلت میں برجس، بوٹ اور کوٹ وغیرہ پہنے، دونوں پیٹیوں

میں کارتوس بھرے۔ پستول بھر کر پیٹی میں لگایا اور رائفل کا میگزین بھی بھر کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ دیکھا کہ چار پانچ سو جنگلیوں کی باقاعدہ فوج نیزوں، ڈھالوں اور تیر و کمان سے مسلح ہمارا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ یہ دیکھتے ہی میرے ہوش جاتے رہے۔ موت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی اور یقین ہو گیا کہ اب ان سے جان بچانا ناممکن ہے۔ کیونکہ گولیوں سے کتنے آدمیوں کو مارا جا سکتا تھا اور ان کو کمک کے حاصل ہو جانے کا امکان بھی بہت کچھ تھا۔ معاً دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کا مقابلہ کرنا ہی عبث ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی رائفل خالی کر لی اور اپنی موت و زندگی کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا۔ مجمع مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ رائفل جو میرے ہاتھ میں تھی، میں نے اُن کے سامنے پھینک دیا۔ سبھوں نے مجھے پکڑ کر مضبوطی سے میرے ہاتھ، پیر رسّے سے باندھ دیئے اور پھر ایک طرف کو ڈال دیا۔ ہمارے کیمپ کا سب سامان لُوٹ لیا اور کیمپ کے کچھ آدمیوں کو مار ڈالا اور کچھ کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد یہ لوگ واپس ہوئے۔ واپسی کے وقت دو جنگلیوں نے مجھے بھی اپنے کندھوں پر لاد لیا اور چل دیئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ عنایت اور احمد وغیرہ کا کیا حشر ہوا، آیا زندہ بچے یا مارے گئے۔ اپنی نسبت تو مجھے یقین کامل ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے اپنی بستی میں لے جا کر انتہائی بیدردی سے قتل کر دینگے اور زندہ نہ چھوڑیں گے۔

اس وقت میرے دل کی جو کچھ حالت ہو رہی تھی، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آج مجھے اپنے والدین کی نافرمانی کے عوض میں یہ سزا مل رہی ہے۔ میں نے اُن کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور اُنکی بلا رضامندی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ یہ اُسی عدول حکمی کی وجہ ہے کہ میں بجائے امریکہ جانے کے میں اس وقت کہاں اور کس حال میں جا رہا ہوں۔ دنیا میری نظروں میں تاریک ہو رہی تھی۔ اس پر بھی مجھے یقین تھا کہ اگر اس وقت کی میری بیکسی و بے بسی کا علم میری قابل احترام و بزرگ والدہ ماجدہ کو خواب میں بھی ہو جائے گا تو وہ صدمہ سے تڑپ کر مر جائیں گی۔ (وہ بڑی بزرگ اور تہجد گذار ہستی تھیں۔ خدا غریق رحمت فرمائے۔)

میں ہمیشہ سخت خطرات اور مشکلات میں مبتلا ہو کر جو زندہ بچتا رہا، اصل میں وہ محض اُنھیں کی دعاؤں کا اثر تھا جو وہ راتوں کو اپنی نیندیں حرام کر کے سجدے میں جا کر مجھ ایسے نالائق و نافرمان بیٹے کے حق میں اللہ جل جلالہٗ کے حضور میں فریاد کرتی تھیں، میں اُنھیں بے حد عزیز تھا اور مجھ سے کمال محبت فرماتی تھیں۔

اب میں اپنے کو دنیا میں صرف چند لمحوں کا اور مہمان سمجھ رہا تھا اور دل ہی دل میں خیال کر رہا تھا کہ یہ لوگ صبح ہوتے ہی مجھے موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔ جنگل میں ان کے شور و غل کا ایک ہنگامہ تھا اور بہت سی مشعلیں روشن کئے ہوئے یہ

بدستور چلے جارہے تھے۔ خبر نہیں کہ یہ لوگ رات کو کس وقت اپنی بستی میں پہنچے۔ وہاں پہنچکر ایک بہت لمبے چوڑے جھونپڑے میں مجھے لے گئے جو سطح زمین سے بلندی پر بنا ہوا تھا اور پھر اُسی کی ایک کوٹھری میں جس کا فرش بانس کا معلوم ہوتا تھا اُسی حالت میں مجھے پھینکدیا گیا اور باہر سے اُس کا دروازہ بند کرکے سب چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد سنّاٹا ہوگیا، جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ سب جاکر سوگئے ہیں۔ کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں کبھی کبھی آجایا کرتی تھیں۔ میں رسّیوں سے اس سختی سے جکڑا ہوا تھا کہ نہ تو کروٹ لے سکتا تھا اور نہ جنبش ہی کرسکتا تھا، جس سے مجھے سخت تکلیف تھی، لیکن کیا کرسکتا تھا، طوعاً و کرہاً اسی حالت میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ نیند کسے آتی تھی طرح طرح کے خیالات دل میں آتے تھے اور جاتے تھے۔ وقت گذر رہا تھا اور موت کی گھڑی قریب آتی جارہی تھی۔ زندگی کی کوئی اُمید باقی نہ تھی۔ آہ! میری بیکسی پر اس وقت نہ تو کوئی آنسو بہانے والا تھا اور نہ افسوس کرنے والا۔

انھیں خیالات میں آخر صبح ہوگئی اور روشنی نمودار ہوئی میں نے کوٹھری میں بہت سے ہتھیار و نیزے وغیرہ پڑے ہوئے دیکھے۔ اب آفتاب طلوع ہوچکا تھا اور کبھی کبھی کچھ عورتوں اور بچّوں کے بولنے کی آوازیں آجایا کرتی تھیں۔ مَردوں کی آوازیں البتہ غائب تھیں بہت ممکن

ہے کہ وہ پڑے سو رہے ہوں۔

اتنے میں یکایک کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان شخص اندر آیا اُس کی شکل و صورت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اُن جنگلیوں کی طرح کریہہ منظر و بدصورت نہ تھا بلکہ گورے رنگ کا ایک ۱۸-۱۹ سالہ نوجوان تھا، وہ ان جنگلیوں کی طرح برہنہ بھی نہ تھا، ایک چھوٹا سا کوٹ اور چمڑے کا چھوٹا پائجامہ پہنے ہوئے تھا اور سر پر پتوں کی ایک بڑی سی ہیٹ تھی میں اُسے حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھ رہا تھا اُس نے بھی اسی نظر سے مجھے دیکھا۔ پھر وہ قریب آکر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اپنے ہاتھ سے میری پیشانی کے بال ہٹائے اور میرے کان کی جانب جھک گیا۔ مجھے اس سے اور بھی تعجب ہوا کہ اس فرشتہ صورت انسان نے مجھ سے عربی زبان میں سوال کیا کہ اَنْتَ هِنْدِیٌ ؟ اِسْلَام ؟ زنجبار اور افریقہ میں جب میں تھا تو کچھ عربی بول لیتا تھا۔ میں نے اُسی طرح وقفے کے ساتھ تین لفظوں میں آہستہ سے جواب دیا "اَنَا..... شریف..... هندی"۔ اس نے سنتے ہی کہا "اَنْتَ..... شریفو؟" عرب میں شریف اور شریفو سید کو کہتے ہیں۔ پھر وہ مجھے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

باب دسواں

قید تنہائی

کچھ دیر بعد لوگوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں تقریباً دس گیارہ بجے کچھ لوگ کوٹھری میں داخل ہوئے۔ جنھیں دیکھتے ہی میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا اور سمجھا کہ اب موت کی گھڑی آگئی۔ انھوں نے میری رسّیاں کھول دیں اور پکڑے ہوئے باہر لے آئے۔ جب ہم اسی بڑے مکان کے دوسرے حصہ میں پہنچے تو دیکھا کہ بہت سے عورت و مرد ایک جگہ فرش پر بیٹھے ہیں اور ایک نہایت ہی بدصورت شخص دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے اِن سب کے درمیان میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی غصّہ سے لال پیلا ہو گیا اور غضبناک حالت میں دانت پیسکر کچھ کہنا شروع کیا۔ یہ ان کا سردار تھا۔ مجمع کی ان بدصورت عورتوں میں مجھے ایک عمر رسیدہ عورت بھی نظر پڑی جو اُن سب سے بالکل الگ تھلگ اور عربی نسل معلوم ہوتی تھی، اُسے دیکھکر بھی مجھے پہلے ہی کی طرح حیرت ہوئی۔ وہ نوجوان لڑکا جو صبح میرے پاس آیا تھا میرے قریب ہی آکر

کھڑا ہوگیا۔ سردار نے اُس لڑکے سے مخاطب ہوکر غضبناک لہجہ میں مجھ سے دریافت کروایا کہ "آپ نے کیوں ہمارے جنگل میں ہمارے آدمیوں کو قتل اور زخمی کیا؟" میں نے جواب دیا۔ میں کئی دنوں سے زخمی ہوکر بستر پر بیمار پڑا ہوا ہوں۔ میں آپ کے جنگل میں کبھی نہیں آیا۔ میں شکار کھیلنے میں زخمی ہوگیا تھا" (میں نے اپنے زخم بھی کھولکر دکھا دیئے)۔ لڑکا سردار کو دیر تک سمجھاتا رہا۔ میں ان کی باتیں تو قطعی نہ سمجھ سکا، البتہ یہ ضرور محسوس کرسکا کہ اب سردار کا غصہ پہلے کی بہ نسبت فرو ہو چلا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا۔ "کہاں سے آئے ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "ہندوستان سے"۔ سردار خاک نہ سمجھا کہ ہندوستان کیا چیز ہے۔ اُس نے متعجبانہ حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ اَلسب ..... اَلسب ..... (عرب) میں نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اُس نے پوچھا۔ زاوا ..... زاوا .... (جاوا) میں نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ اب تو اُس کے حیرانی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ مذکورہ ملکوں کے علاوہ دنیا میں کوئی اور ملک بھی ہے جہاں انسان رہتے اور بستے ہیں۔ لڑکا دیر تک جنگلی زبان میں سردار سے باتیں کرتا رہا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری جانب سے میری رہائی کے لئے وکالت کر رہا تھا۔ پھر وہ دیر تک مجھ سے ملائی زبان میں گفتگو کرتا رہا۔ وہ ملائی زبان بخوبی بول لیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کچہری برخاست ہوگئی لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ میرے لئے

کیا فیصلہ اور حکم صادر ہوا ہے۔ مگر اُس وقت مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا جب چار مسلح جنگلیوں نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا اور مجھے لیکر بستی سے باہر چلدیئے۔ اب میں اس کے سوا اور کیا خیال کر سکتا تھا کہ یہ لوگ مجھے بستی سے باہر قتل کرنے کے واسطے لئے جا رہے ہیں۔ البتہ مجھے اس پر تعجب ضرور تھا کہ سردار نے نہ تو میری جامہ تلاشی لی اور نہ میرے جسم پر سے کوئی چیز اُتاری گئی۔ پستول، پیٹی، کارتوس، چاقو، حتیٰ کہ کچھ ڈالر نقد اور نوٹ بھی میرے جیب میں موجود تھے کسی چیز میں بھی ہاتھ نہ لگایا گیا۔ بجز اس کے کہ میری خاکی ہیٹ جو میری گرفتاری کے وقت وہیں گر گئی تھی اس وقت بھی نہ تھی اور میں ننگے سر تھا۔

بستی سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر پہنچکر ایک بہت بڑی جھیل نظر آئی جو سمندر کی طرح میلوں لمبی چوڑی تھی، وہاں ان لوگوں نے ایک چھوٹی سی کشتی پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ معاً مجھے خیال پیدا ہوا کہ غالباً یہاں بھی ریاست بروتی کی طرح مجرم کو سزا دینے کا طریقہ رائج ہے اور یہ لوگ مجھے قتل کرنے کی بجائے پانی میں پھینک دیں گے تاکہ آبی جانور میرا کام تمام کر دیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ شیانگ ڈاکو کی موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

میرے کشتی میں بیٹھ جانے کے بعد وہ روانہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ جھیل کے اندر دُور خشکی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو جزیرہ کی صورت میں

نظر آرہا ہے۔ یہ کشتی اُسی طرف جارہی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے سپاہی کشتی سے اُترے اور پھر مجھے بھی اُتر آنے کا اشارہ کیا۔ جب میں اُتر کر کھڑا ہو گیا تو اُنھوں نے اپنی زبان میں مجھ سے کچھ کہا اور پھر سمجھانے کی کوشش کی، لیکن میں مطلق نہ سمجھ سکا اور یہی خیال کر رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے یہاں قتل کر دیں گے، اس لئے کہ مجھے اپنی جاں بخشی کا تو یقین ہی نہ تھا۔ مگر اُس وقت مجھے اصل حقیقت سے آگاہی ہو گئی جب وہ لوگ مجھے اس چھوٹے سے جزیرہ میں تنہا چھوڑ کر واپس چلے گئے کہ میں یہاں قید کر دیا گیا ہوں۔ ان جنگلیوں نے اس جزیرہ کو اپنا قید خانہ بنا رکھا تھا اور جب اُنھیں اپنے کسی مجرم کو قید کی سزا دینا مقصود ہوتا تھا تو وہ اُسے یہیں لاکر چھوڑ دیتے تھے۔

اِن لوگوں کے چلے جانے کے بعد مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اپنی بیکسی، بے بسی، قید تنہائی اور بے سروسامانی کا احساس کرتے ہوئے میرا دل بھر آیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، مگر وہاں تھا کون جو مجھے تسلی دیتا۔ دل کا کچھ بخار نکل جانے کے بعد میں نے کنارے پر بیٹھ کر منھ ہاتھ دھویا اور پانی پیا۔ پھر خود ہی اپنے دل کو سمجھایا کہ اتنی کمزوری کا اظہار اچھا نہیں، صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے اور صرف خدائے پاک کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیئے جس کے قبضۂ قدرت

موجودہ مصیبت و تکلیف کا دُور کر دینا معمولی سی بات ہے۔ رونے دھونے سے کیا حاصل؟ اور پھر عرفی کے اس شعر نے بھی تقویت پہنچائی۔

عرفی! اگر بہ گریہ میسّر شود وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اس خیال کے آتے ہی میری طبیعت کسی قدر سنبھل گئی۔ میں نے اُٹھ کر ایک درخت کی لکڑی ہاتھ میں لی اور پھر پورے جزیرے کا جائزہ لے آیا۔ یہ خشکی کا ٹکڑا کم و بیش نصف میل لمبا اور پاؤ میل چوڑا ہے۔ دو مقام پر پتھروں میں سے اسی کے اندر چشمے جاری ہیں جن کا پانی نہایت صاف و شیریں ہے۔ مجھے یہاں اس سے کسی قدر طمانیت حاصل ہوئی کہ کچھ درختوں پر جنگلی پھل لگے ہوئے تھے۔ ایک مقام پر انناس بھی پائے۔ اس سے کچھ فاصلہ پر ایک جگہ درخت میں چھوٹی قسم کے کٹہل بھی نظر آئے۔ میں بھوک سے بیتاب ہو رہا تھا، ایک کٹہل توڑ کر کھایا اور چشمہ سے پانی پیا۔ شام ہو رہی تھی۔ مجھے اس نئی اور سنسان جگہ میں یہ فکر ہوئی کہ یہاں رات کیسے بسر ہوگی اور سونے کا کیا انتظام ہوگا۔ لکڑی کاٹنے کا میرے پاس کوئی سامان نہ تھا اور نہ رسّے تھے کہ اُن سے درخت پر مچان بنانے میں مدد ملتی، چشمے سے تھوڑے فاصلہ پر ایک درخت خوب پھیلا ہوا تھا اُس پر چڑھ کر میں نے خوب دیکھ بھال کی، پھر نیچے اُتر آیا۔ ادھر اُدھر سے کچھ لکڑیاں تلاش کیں۔ چاقو سے ایک درخت کی سبز چھال اُتاری

یہ سب سامان اُسی درخت پر لے گیا اور ایک مناسب جگہ پر ان لکڑیوں کو چھال سے باندھ کر مچان بنایا۔ رات ہونے سے قبل ہی میں مچان پر جا کر لیٹ گیا۔ رات کے آتے ہی بڑے بڑے مینڈک بولنے لگے۔ پانی کے اندر جھیل میں بڑی مچھلیاں یا گھڑیالوں کے اچھلنے کودنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ چونکہ میں گذشتہ رات کا جاگا ہوا تھا، جلد سو گیا جھیل اور نیز ہوا کی وجہ سے رات کو ایسی خنکی تھی کہ مجھے سردی محسوس ہوا کی۔ مگر میرے پاس اوڑھنے یا بچھانے کے لئے تھا ہی کیا؟ خالی لکڑیوں پر سونے میں مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ میرے بدن پر زخموں کی تکلیف اور رسّیوں کے نشانات ابتک باقی تھے۔ بہر حال رات کسی طرح بسر ہو گئی۔ صبح ہوئی تو درخت سے اُترا۔ چشمہ پر جا کر منھ ہاتھ دھویا۔ دو اناناس اور ایک کھٹل توڑ کر لے آیا اور ان میں سے تھوڑا تھوڑا کھایا۔ یہاں کھجور کی قسم کے درخت بہت سے تھے۔ میں ان کی بہت سی شاخیں کاٹ کر لے آیا ان کے پتے جدا کئے، شاخوں کو علیحدہ کیا۔ لمبے پتوں کو ملا کر میں نے کئی چٹائیاں بنا ڈالیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں اس کام سے واقف نہ تھا مگر پھر بھی اچھی خاصی عمدہ چٹائیاں بنا لیں انھیں میں نے مچان پر بچھا دیا جن سے مجھے بے حد آرام ملا۔ پھر انھیں کھجور

کی شاخوں اور پتیوں سے میں نے اپنے لئے ایک بڑی ہیٹ کے نمونے کی ٹوپی بنائی۔ اس ٹوپی سے مجھے دھوپ میں آرام ملا۔ اس شغل میں وقت خوب کٹا اور دوپہر ہوگئی۔ ایک بجے کے قریب بھوک معلوم ہونے لگی۔ چشمہ پر بیٹھ کر غسل نہایا اور وضو کیا۔ سچ ہے کہ مصیبت کے وقت انسان کے دل میں اللہ کی یاد بہت آتی ہے۔ میں نے اپنی محنت سے بنائی ہوئی چٹائی ایک طرف صاف زمین پر بچھائی اور ظہر کی نماز کی نیت باندھ کر اپنے مالک حقیقی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ نماز میں دیر تک ایک محویت رہی جو بیان نہیں ہوسکتی۔ نماز سے فارغ ہوکر سجدہ میں گر کر رب العزت سے اپنی مخلصی اور کامیابی کے لئے دعا مانگتا رہا۔ پھر چشمہ کے کنارے بیٹھ کر کٹھل اور اناناس کھایا اور پانی پیا۔ اس کے بعد وہیں بیٹھا ہوا دیر تک اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔

ملک کا یہ حصہ جس میں اس وقت میں مقید تھا۔ سارا واک کی سرحد سے یا ڈچ کے علاقہ میں واقع ہے۔ کیلی قوم کے لوگ سرحد پر بود و باش رکھنے کی وجہ سے نیم آزاد ہیں۔ سرحدی علاقے میں دور تک ان کی بستیاں پھیلی ہوئی ہیں اور یہ لوگ ہر جگہ شورش پسند ہیں۔ لوٹ مار اگرچہ ان کا روز کا اصلی مشغلہ ہے لیکن پھر بھی ان کو مال و دولت کی مطلق پروا نہیں ہے صرف کھانے پینے اور پہننے کے سامان سے سروکار رکھتے ہیں یا سفید رنگ کے

آدمیوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت پکڑ کر لے آتے ہیں اور ان سے اپنی خدمات بطور غلامی لیتے ہیں۔

اس وقت آفتاب غروب کے قریب تھا، میں نے تھوڑا سا اناناس اور کھایا۔ اندھیرا ہونے سے قبل چٹائیاں لیکر میں مچان پر چلا گیا اور وہاں دیر تک اس اُدھیڑ بُن میں مصروف رہا کہ اس قید کا کیا انجام ہوگا۔ اس حال میں کب تک رہوں گا اور یہاں سے رہائی کی کیا صورت ہوگی۔ تنہائی کا عالم ہے، نہ کوئی غمخوار ہے اور نہ مددگار۔ آخر انھیں متوحش خیالات میں غرق رہ کر آنکھ لگ گئی اور سو گیا۔

۱۲ بجے کے قریب شب میں یکایک میری آنکھ پھر کھل گئی۔ ہر طرف ایک سناٹے اور ہُو کا عالم تھا، جس طرف نظر جاتی تھی مہیب و خوفناک منظر پاتی تھی۔ چاند اپنی پوری روشنی سے فیاضی کے ساتھ ضیا باری کر رہا تھا میں اس ویرانہ میں درخت کے مچان پر پڑا ہوا پہروں تک جاگتا رہا اور کوشش کر رہا تھا۔ پھر سو جاؤں لیکن کمبخت نیند نہ آتی تھی نہ آئی گویا اُس نے آنے کی قسم کھالی تھی، تاہم اسی اُمید میں ایک پہلو کروٹ لئے ہوئے پڑا تھا کہ اچانک میرے کان میں ایک دردانگیز و دلسوز آواز آئی۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت اور یہاں کس کی آواز آ سکتی ہے یہ محض میرا واہمہ ہے اور میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد پھر اُسی

آواز نے مجھے اپنی جانب مخاطب کرلیا۔ میں نے حیران ہو کر بغور اس طرف اپنی توجہ کرلی۔ اب یہ آواز کسی قدر قریب ہو گئی تھی۔ میں جاگ تو رہا ہی تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے تحیر کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے سنا کہ کوئی شخص عجیب دردناک آواز میں جوگ کے سوز میں بلند آواز ہی سے کچھ گا رہا ہے۔

میری نگاہیں اسی جانب اٹھی ہوئی تھیں اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ کیا راز ہے اس ویرانے میں، اس سنسان مقام پر، اس رات کے سناٹے میں کسی انسان کا گذر کہاں؟ اور سب سے زیادہ حیرت تو یہ تھی کہ یہ آواز کسی مہذب شخص کی معلوم ہوتی تھی جو بے حد دردناک، سوز و گداز سے لبریز اور دل میں اتر جانے والی صاف جوگ کے رنگ اور دلکش ترانے کی صورت میں برابر آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں کے جنگلوں میں تو وحشیوں کی آبادی ہے انھیں گانے سے کیا واسطہ؟ وہ کیا جانیں کہ گانا یا رنگ اور سوز کس جانور کا نام ہے۔

آواز اب اور قریب سے آئی۔ اس میں سوز و گداز بدستور تھا اور اب میں نے محسوس کیا کہ یہ دلکش اور پیاری آواز کسی مرد کی نہیں بلکہ عورت کی ہے جو اپنے باقاعدہ ترنم سے دل میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر کے اپنی جانب اسے کھینچے لے رہی ہے۔

مجھے علم موسیقی سے ہمیشہ سے دلچسپی تھی چنانچہ اس وقت کی بیخودی نے مجھے خود بھی گانے پر مجبور کر دیا۔ گویا گانا تھا کہ خود بخود خیر سے دل سے نکلا آتا تھا یہ میں نے

بھی بلند آواز سے جوگ ہی کی دردناک دُھن میں اپنے حسبِ حال ایک غزل گانی شروع کردی، جس کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی ہے :-

"دکھاتا رنگ ہے کیا کیا مقدّر کا بدل جانا

اور پوری غزل گائی۔ جوگ کا رنگ، جنگل کا عالم، رات کا سنّاٹا، میری آواز پہاڑوں سے ٹکرانے لگی۔ میرے گانا شروع کرتے ہی وہ آواز رُک گئی۔ میں درخت پر بیٹھا ہوا گا رہا تھا اور اتنا محو ہو رہا تھا کہ مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ چاند کی روشنی بدستور صاف طور پر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میری نگاہ ایک انسانی سایہ پر پڑی جو میری جانب بڑھتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنے گانے کا سلسلہ جو اب تک جاری کئے ہوئے تھا بند کردیا اور اُسی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سایہ قریب کے درختوں میں آکر غائب ہوگیا۔ اب پھر وہی خاموشی اور سنّاٹے کا عالم تھا۔ میرے دل پر کسی قدر خوف غالب ہوگیا اور میں نے یقین کرلیا کہ یہ تمام کارروائی کسی جن کی ہے۔ پانچ منٹ کے بعد بالکل ہی قریب سے آواز آئی "شریفو ..... شریفو ..... شریفو! اور اب میں نے بخوبی آواز سے پہچان لیا کہ یہ تو وہی نوجوان لڑکا ہے جس نے ان وحشیوں کے سامنے میری جانب سے وکالت کرکے میری جان بچائی ہے۔ یہ تو میرا عزیز محسن ہے اور فوراً اُس کی بھولی بھالی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ میں بیخودی

کے عالم میں درخت سے کود پڑا اور بے تحاشا دوڑ کر اُس کے پاس پہنچا۔ وہ سراپا سپردگی مجھے دیکھتے ہی درختوں سے نکلکر میرے لپٹ گیا۔ میں بھی اُسے جوشِ ممنونیت میں دیر تک لپٹائے رہا اس لئے کہ اسی کی بدولت آج میں اس دنیا میں زندہ تھا۔ میرا سر اُس کے بارِ احسان سے جھکا جاتا تھا، اور میرے دل میں اُس کی ایک خاص وقعت تھی۔

اصل میں ہم دونوں مصیبت زدہ اور ان وحشیوں کے قیدی تھے۔ اس مقام سے ہٹ کر ہم دونوں کھلی ہوئی جگہ میں آئے۔ چاند کی روشنی میں اُس کے چہرے کی گوری رنگت نکھر کر اور بھی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کی شجاعت و دلیری پر عش عش کر رہا تھا کہ یہ کس قدر قوی دل اور نڈر نوجوان ہے کہ اس رات کے سناٹے میں اس جنگل کو طے کر کے اس نے تنہا یہاں آنے کی جسارت کی۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ تنہا رات کو یہاں چلے آئے؟ اُس نے جواب میں نظریں نیچی کر کے کہا کہ آپکی محبت یہاں کھینچ لائی۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر کی۔ دو بج چکے تھے۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا اگر بارِ خاطر نہ ہو تو مجھے اس امر سے مطلع کرنے کی تکلیف گوارہ فرمایئے کہ آپ کون ہیں، یہاں کب اور کیسے آئے، اور ان جنگلیوں کا آپ سے کیا تعلق ہے؟

باب گیارھواں

عبو کی سرگذشت

اُس نے میرے اس سوال پر ایک آہ سرد کھینچی اور کہا آہ!
سرگذشتِ بلاکشاں نہ سُنو!
نہ سُنو! میری داستاں نہ سُنو

آہ! قسمت نے ہمیں ۶ سال سے ان جنگلیوں کا قیدی بنا رکھا ہے میری پیدائش سے قبل میرے دادا مع اپنے کنبہ کے سنگاپور چھوڑ کر بورنیو چلے آئے تھے اور بنٹالو میں (جو میسیری اور سارا واک کے درمیان میں سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا مقام ہے) بود و باش اختیار کر کے تجارتی کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہاں سے وہ مختلف قسم کے سامان سنگاپور بھیجتے اور سنگاپور سے کپڑے وغیرہ منگواتے رہتے تھے۔ اس طرح پر اُن کا کام خوب چلنے لگا، اور وہ بہت جلد خوش حال ہو گئے۔ بنٹالو میں انھوں نے کئی قطعہ مکانات تعمیر کروائے اور جائداد بھی خرید لی۔ ہمارے اعزا، عرب لوگ ملایا کے علاوہ بورنیو کے اکثر مقامات پر بھی رہا کرتے تھے۔ میرے والد ماجد اپنے باپ کے

اکلوتے بیٹے تھے۔ میری ولادت پر دادا نے بڑی خوشی منائی، اور میری پرورش و پرداخت بڑے لاڈ و پیار سے ہونے لگی۔ جب میری عمر ۶ سال کی ہوئی تو دادا نے گھر پر ایک معلّم رکھ کر میری تعلیم شروع کی اور میں نے اپنی چھوٹی سی عمر ہی میں قرآن مجید ختم کر لیا۔ بہت سی کتابیں پڑھیں اور لکھنا بھی سیکھا۔ ۱۲ برس کی عمر سے میں اپنے والد بزرگوار اور دادا کے ساتھ تجارتی کاروبار میں حصہ لینے لگا میرے دادا اور دادی مجھ سے بیحد محبت رکھتے تھے۔ میرے دادا کے بڑے بھائی ہم لوگوں سے بہت دُور جنگلوں میں رہتے تھے جہاں وہ جنگلوں کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اُن کا بھی بڑا کاروبار تھا۔ جب میری عمر ۱۳ برس کے قریب ہوئی تو میرے دادا کے بھائی نے میرے دادا کو مجبور کیا کہ تم مع سب لوگوں کے سال چھ مہینے کے لئے میرے پاس آ جاؤ۔ دادا نے کاروبار کے نقصان کے خیال سے اور بڑے بھائی کی خوشنودی و خاطر کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کیا کہ اُنھوں نے میرے والد، والدہ، دادی اور مجھے گویا پورے گھر کو اُن کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ ہم تین گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ گھوڑے پر تھا۔ دو ملازم ساتھ تھے اور دو گھوڑوں پر رسد اور دیگر ضروری سامان بار تھا۔

ہم کئی روز سفر طے کرنے کے بعد ایک قصبہ کیپٹ نامی میں پہنچے۔ وہاں دو روز قیام کر کے ہم نے آرام کیا۔ ابھی ہمیں ۶۰ میل اور جنگلی سفر طے کرنا تھا

جب صرف ایک دن کا سفر اور باقی رہ گیا تھا اور ہم اپنی منزل پر جنگل میں بڑے شوق سے چلے جا رہے تھے تو اچانک ان کیلی جنگلیوں نے جنگل سے نکلکر حملہ کر دیا۔ والد ماجد اور دونوں ملازموں نے بڑی بے جگری اور بہادری سے ان سفاکوں کا مقابلہ کیا مگر آہ! ان کے ہاتھوں وہ غریب جاں بر نہ ہو سکے۔ (آواز گلوگیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر اس نے اپنے کو سنبھالکر بیان کرنا شروع کیا) اس کے بعد یہ ظالم مجھے، میری والدہ اور دادی کو گرفتار کر کے مع سامان یہاں لے آئے۔ والدہ ماجدہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکیں اور آہ! ہمیں اس مصیبت میں چھوڑ کر ایک سال کے اندر ہی جنت کو سدھار گئیں (آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔ میری تسلی و تشفی پر اس نے پھر طبیعت سنبھالکر سلسلہ کلام جاری کر دیا) میں اور میری دادی دونوں اب تک یہاں موجود ہیں اور شبانہ روز ان جنگلیوں کی خدمت کر کے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ دادی آج تک تنہائی میں جب موقع ملتا ہے اپنے اور میرے حال پر آٹھ آٹھ آنسو روتی رہتی ہیں مگر آہ! رہائی و مخلصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اللہ پاک سے ہماری دلی دعا ہے کہ وہ ان ظالموں کے پنجہ سے ہمیں جلد سے نجات عطا فرمائے ہم اپنی اس مجبورانہ اور بے بسانہ زندگی سے سخت عاجز آ گئے ہیں اور عقل نہیں کام کرتی کہ اپنی رہائی کے لئے کیا تدبیر اختیار کریں۔

آپ کو دیکھتے ہی مجھے شبہ ہوا تھا کہ آپ عرب ہیں، مگر آپ سے معلوم ہوا کہ آپ سندی ہیں، تاہم مجھے آپ کے ساتھ اُنس و ہمدردی اُسی وقت سے پیدا ہوگئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ میں نے جنگلی سردار سے آپ کے بچانے میں اپنی پوری سعی و کوشش سے کام لیا اور آپ قسمت والے تھے کہ اُس کی سمجھ میں آگیا ورنہ وہ اپنی عادت کے مطابق آپ کو قتل کر دیتا۔

اُس کا یہ حال سُننے کے بعد میں نے بھی اُس سے مختصراً اپنی سرگذشت کہہ سُنائی اور اس طرح دو گھنٹے چشم زدن میں گذر گئے۔ اب چار بجے کے قریب وقت تھا اور اُس کو جلد واپس چلا جانا چاہیئے تھا۔ اپنی اس تنہائی و بے بسی میں اُس کی ہمدردی سے مجھے جو کچھ تقویت حاصل ہوئی بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اُس سے ایک طرح کی دلی محبت ہوگئی تھی۔ میں خیال کر رہا تھا کہ یہ ویرانہ میرے لئے نمونہ جنت بن جائے اگر یہ رفیق میرے ساتھ یہیں رہنے لگے میں نے اُس کا نام دریافت کیا تو اُس نے عبدالرحمن بتلایا لیکن کہا کہ مجھے سب عبّو کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ بھائی کچھ بھی ہو ہمیں اپنی رہائی کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی چاہیئے۔ اُس نے جواب دیا کہ آج تو مجھے دیر ہو گئی ہے، میں جا رہا ہوں، کل انشاء اللہ رات کو پھر آؤں گا تو اس مسئلہ پر ہم اور آپ ملکر غور کریں گے۔ یہ سنکر کہ وہ کل رات کو پھر آئے گا مجھے بڑی خوشی ہوئی وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا، اور اُس نے محبت سے میری گردن میں

ہاتھ ڈال دیئے۔ میں اُسی طرح لئے ہوئے اُسکو جھیل کے کنارے تک آیا کشتی پر سوار ہونے کے قبل ہم نے اس کو ایک مرتبہ اور گرم جوشی سے لپٹا لیا۔ کشتی پر سوار ہونے کے بعد وہ ہمیں ایک کُلھاڑی اور ایک تھیلی دیکر روانہ ہوگیا۔ نیزہ، ڈھال اور دیگر ہتھیار کشتی میں رکھے ہوئے تھے۔ کلھاڑی اور تھیلی لیکر میں مچان پر آگیا۔ تھیلی کھول کر دیکھا تو اُس میں بھُنے ہوئے چاول تھے جو اس وقت میرے لئے ایک بڑی نعمت تھے، اور کُلھاڑی بھی یہاں بڑے کام کی چیز تھی۔

اس کے بعد دیر تک میں مختلف خیالات میں غرق رہا۔ حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ درخت سے اُتر کر چشمہ پر گیا۔ وضو کر کے نماز فجر ادا کی اور دیر تک خلوص دل سے دعائیں مانگتا رہا۔ مجھے اپنے محسن عبو کے ملجانے سے بڑی تقویت ہوگئی تھی اور کسی قدر رہائی کی اُمید بھی ہوگئی تھی۔

نماز سے فارغ ہوکر وہیں چشمہ کے کنارے میں نے ناشتہ کیا اور پھر کُلھاڑی لے کر کھجور کی بہت سی شاخیں کاٹ کر لے آیا جن کے لمبے لمبے پتّے توڑ کر دھوپ میں پھیلا دیئے۔

مجھے اپنے مچان کو بہتر اور آرام دہ بنانے کے لئے عمدہ اور صاف لکڑیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے کلھاڑی کندھے پر رکھی سر پر اپنی بنائی ہوئی ٹوپی اوڑھی اور جزیرہ کے درختوں کا جائزہ لے کر کافی تعداد

میں لکڑیاں کاٹ کر لے آیا۔ اس سے فارغ ہو کر سبز درختوں سے چھالیں اُتاریں اور حسب منشاء دوبارہ مچان کو بہتر طریقہ پر آرام دہ بنالیا۔ پھر اُس پر چٹائیاں بچھادیں۔ اس پوری مصروفیت میں تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ اب کوئی کام باقی نہ تھا۔ اس نے مچان پر لیٹا اور سو گیا۔ خوب نیند آئی۔ تقریباً ۲ گھنٹے سوتا رہا۔ ۲ بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ بھوک معلوم ہو رہی تھی، اُٹھکر انناس کھایا، پھر چشمہ کے کنارے بیٹھکر چٹائی بننے میں مصروف ہو گیا۔ خوب لمبی چوڑی بنائی جو نماز پڑھنے اور بیٹھنے کے لئے بہت کافی تھی۔ پیٹی پستول اور کوٹ اُتار کر مچان کے قریب ایک شاخ پر لٹکا دیئے اس لئے کہ یہاں ان کو ہر وقت اپنے ساتھ لگائے رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نئی چٹائی کو میں نے چشمہ کے کنارے مستقل طور پر بچھا دیا تاکہ بیٹھنے کے کام میں آئے۔ اب شام کا وقت تھا اور سورج سرائے مغرب میں پہنچکر چھپا چاہتا تھا۔ اِرد گرد کا منظر نہایت دلفریب تھا، جھیل میں پانی کی لہریں دُور تک بل کھاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کچھ فاصلہ پر سبز سبز پہاڑ اور جنگل اپنی بہاریں دکھا رہے تھے۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے سپیم آجا رہے تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر ان کا میرے دل پر خاک اثر نہ تھا۔ البتہ ایک اُمید موہوم تھی جو رہ رہ کر سہارا دے رہی تھی کہ گھبراؤ مت شب میں عبور کے آجانے پر بہت ممکن ہے کہ خدا کوئی رہائی کی صورت پیدا کردے اور یہی وجہ تھی کہ اس کی آمد کی یہ گھڑیاں پہاڑ سی ہو رہی تھیں اور

کاٹے نہ کٹ رہی تھیں۔ میں سراپا انتظار بنا ہوا بے صبری کے ساتھ اُس کی آمد کے لئے چشم براہ تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی محبت بھی اب میرے دل میں کافی طور پر جاگزیں تھی اس لئے کہ اُس نے میرے ساتھ صرف اتنا ہی احسان نہیں کیا تھا کہ میری جان بخشی کرائی ہو بلکہ اُس نے محض میری سپردگی و محبت میں اپنی نیند و آرام حرام کرکے میری خبر گیری کے لئے اس ویرانہ میں بھی آنے کی زحمت اُٹھائی تھی۔

سورج غروب ہوئے عرصہ ہو چکا تھا اور ہر چہار طرف تاریکی کا دور دورہ تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری بیتابی بڑھتی جاتی تھی۔ سچ ہے

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک　　آتشِ شوق تیز تر گردد

بیٹھے بیٹھے طبیعت اُکتا گئی تو مچان پر جا کر لیٹ رہا کہ کچھ وقت یوں ہی گزرے۔ مگر وہاں بھی کروٹیں ہی بدلتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ جنگو ۱۲ بجے سے قبل نہ روانہ ہو سکے گا اس لئے کہ عموماً گانوں والے دیر میں سویا کرتے ہیں۔ انسان کی تنہائی کی زندگی بھی اللہ اللہ کس درجہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پیٹی سے پستول نکالا جو اب تک بھرا ہوا تھا، پھر اُسے اپنی کمر بس کے جیب میں رکھ کر درخت سے اُتر پڑا اور کھلے میدان میں جا کر گھڑی پر نظر کی تو ۱۱ بج چکے تھے۔ جھیل کے کنارے جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماہتاب نے سامنے کے پہاڑ سے سر بلند کیا جس سے تاریکی نے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کر دیا میں

یہاں عبو کے استقبال کی غرض سے آیا تھا اور کیوں نہ آتا؟ اُس نے میرے ساتھ قابلِ قدر سلوک کیا تھا۔ علاوہ بریں جہاں مجھے اُس سے اس باعث دلی تعلق تھا وہاں اُسے بھی میرے ساتھ اُلفت و محبت تھی اور جو اُس کے افعال و کردار سے صاف عیاں تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا کچھ سبب یہ بھی ہو کہ اس وحشت خیز مقام پر مدّتوں بعد اُسے اپنی مانند ایک شخص کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ یوں بھی وہ قدرت کی فیاضیوں کی بدولت مقناطیسی کشش رکھنے والی آنکھوں، صورتِ زیبا اور بہادر و نڈر دل کا پورا پورا مالک تھا۔

اب ۱۲ بج چکے تھے، چاند کی روشنی ہر طرف کھیت کر چکی تھی اور میں عبو کی آمد کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ دور سے وہی جوگ کی لَے میں دلکش آواز سُنائی دی۔ آج بھی اُس میں وہی سوز و گداز تھا جو شبِ گذشتہ میں میں سُن چکا تھا۔ یہ عبو ہی تھا جو اپنی دُھن میں گاتا ہوا کشتی پر چلا آ رہا تھا لیکن جب اُس نے مجھے کھڑا ہوا دیکھ لیا تو گانا بند کر دیا۔

کشتی کے کنارے لگتے ہی وہ کود کر میرے سینہ سے لپٹ گیا، میں بھی دیر تک محبت میں اُسے ہم آغوش بنائے رہا۔ پھر کشتی کو باندھ کر میں عبو کو لئے ہوئے اپنے مقام پر آیا اور ہم دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ چاند کی روشنی میں اُس کا صبیح و ملیح چہرہ دیکھکر میری زبان سے بے اختیار نکل گیا کہ عبو! تمھاری صورت خدا نے کیسی پیاری بنائی ہے اور تمھاری آنکھوں میں بلا کا جادو بھر دیا

ہے اور تمھاری بہادری اور دلیری تو اور بھی قابلِ ستائش ہے۔ اُس نے شرماتے ہوئے سر جھکا لیا اور کہا یہ محض آپ کے حسنِ اخلاق اور عزت افزائی کا باعث ہے جو مجھ ناچیز کو یوں خیال فرماتے ہیں ورنہ میں کیا اور میری ہستی کیا؟ زاں بعد وہ نہایت ادب سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔

پھر میں نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا کہ عبو! تم نے رہائی کے مسئلہ پر کچھ غور کیا، آخر کیا تدبیر کی جائے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں اور دادی اس معاملہ پر آج تمام دن سوچتے رہے۔ یہاں سے رہائی کا سوال بہت مشکل نظر آتا ہے۔ بالفرض اگر ہم یہاں سے بھاگنے کا حوصلہ بھی کریں تو یہ جنگلی درندے ہمارا تعاقب کر کے ہمیں زندہ نہ جانے دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ سردار اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر اکثر لوٹ مار کے لئے باہر چلا جاتا ہے اور سفتوں غائب رہتا ہے اور اُس وقت ہمیں بھاگنے کا کافی موقع مل سکتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ بالفرض اگر ہم ان وحشیوں سے جان بچا کر بھاگ بھی نکلے تو راہ کے گھنے جنگلوں کے درندوں سے ہماری جانیں کس طرح بچ سکیں گی۔ شیر، چیتے، ریچھ، سور اور گوریلا وغیرہ سبھی تو ہماری جانوں کے دشمن ہیں۔

میں نے کہا۔ عبو! اگر ہم نے ہمت و جرأت سے کام لیا اور انھیں کمزور خیالات میں مبتلا رہے، تو یاد رکھو کہ مدت العمر اس قید اور مصیبت سے رہائی نہیں پا سکتے۔ ہمارا یہ یقین ہی نہیں بلکہ ایمان ہے کہ ہر انسان کی موت کا ایک

وقت مقرر ہے اور وقت سے پہلے خواہ کیسا ہی زبردست خطرہ کیوں نہ ہو موت ہرگز نہیں آتی اور کوئی نہ کوئی سامان زندگی کا غیب سے نکل آیا کرتا ہے۔ میری مثال خود تمھارے پیش نظر ہے۔ میری موت کا وقت ابھی نہیں آیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمھارے ذریعہ سے مجھے ان جنگلیوں سے بچا لیا۔ اگر ہماری موت کا وقت ابھی نہیں آیا ہے تو ہم جنگلی درندوں سے بھی یقینی بچ سکتے اور سلامتی سے اپنے گھروں کو پہنچ سکتے ہیں، اور اگر وہ آگیا ہے تو ہم یہاں بھی مر سکتے ہیں۔ اور معمولی سا سانپ ہی نکلکر ہمارا کام تمام کر سکتا ہے۔ تم سوچو تو کہ اس قید کی زندگی سے موت کیا بُری ہے۔ میرے نزدیک تو اس ذلت کی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے۔ عبو چونکہ ایک دلیر اور بہادر نوجوان تھا میری تقریر سنکر وہ جوش میں اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا اب ہم ضرور قسمت آزمائی کریں گے۔ خدا ہماری مدد کرے گا۔

میں نے کہا۔ شاباش! عبو شاباش!! میں تمھاری اس جرأت سے بہت خوش ہوا۔ خداوند تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔

اچھا! بیٹھ جاؤ، اور ایک بات اور سنو! جب ان جنگلیوں نے مجھے گرفتار کیا تھا اور کیمپ کو لوٹا تھا تو میری ایک بندوق بھی یہ لوگ دیگر سامان کے ساتھ لے آئے تھے، اگر وہ بندوق کسی طرح تمھارے ہاتھ لگ سکے تو تم اسے حاصل کرکے ضرور لے آنے کی کوشش کرو۔ اگر وہ بندوق مجھے مل گئی تو ہم

جنگلوں میں درندوں کا مقابلہ بھی بہ آسانی کرسکیں گے۔ عبو نے جواب دیا کہ آپ مجھے سمجھا دیجیئے کہ وہ کیا چیز ہے تاکہ میں اُس کے حصول کی فکر کروں۔ تمام چیزیں سردار کے گھر میں بند پڑی ہوئی ہیں، مجھے اُس کو لانے میں کوئی وقت نہ ہوگی، اور نہ وہ اُن کے کام کی چیز ہے۔ آپ مجھے اُس کا نقشہ بنا کر سمجھا دیجیے۔ میں کل یا پرسوں جب موقع ملے گا، لے آؤں گا۔ میں نے اُٹھکر چاند کی روشنی میں ایک لکڑی سے زمین پر اپنی ۵۰۴ بور رائفل کا پورے سائز میں نقشہ بنایا اور اُس کو سمجھا دیا کہ اس کا صرف یہ حصہ لکڑی کا ہے اور باقی سب لوہا ہے۔ وہ خوب سمجھ گیا۔ پھر اُس نے کہا کہ اب ہم موقع کا انتظار کریں گے تاکہ جب سردار اور اُن کے ساتھی دور مسافت پر جائیں تو ہم اُن کی عدم موجودگی میں اطمینان کے ساتھ فرار ہوسکیں۔ میں اپنی دادی کو بھی اپنا ہمخیال کر کے ضرور ساتھ لے چلوں گا۔ اور کل میرا انتظار نہ کیجیے گا، انشاء اللہ پرسوں مع بندوق کے اسی وقت حاضر ہوں گا۔ مجھے اُس کی جدائی بیحد شاق تھی لیکن مجبوری تھی۔ گھڑی میں ۳ بج چکے تھے، وہ جانے کے لیے تیار ہوگیا اور جاتے وقت ایک عجیب حسرت کی نظر ڈالتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اُس کی کشتی روانہ ہو جانے کے بعد میں بھی مچان پر آکر سو گیا۔ صبح کو دیر میں آنکھ کھلی، ۹ بج چکے تھے اور ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی، میں ناشتہ کے بعد حسب معمول کام میں لگ گیا۔ میں نے ٹوپی پہنکر کلھاڑی ہاتھ میں لی اور خوب

محنت سے درختوں پر چڑھ کر بہت سی لکڑیاں کاٹیں، اسی طرح کھجور کی بھی بہت سی شاخیں کاٹ کر لے آیا۔ رات کو ہوا کی خنکی کی وجہ سے مجھے سردی معلوم ہوتی تھی اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ مچان کو چاروں طرف سے بند کر کے کمرے کی شکل میں بنا لوں تاکہ رات کے وقت ہوا اور ٹھنڈ سے محفوظ رہ سکوں۔ میں نے کلہاڑی سے لکڑیوں کو صاف کیا۔ ضرورت کے مطابق سب کو کاٹ کر برابر کیا۔ پھر پتلی پتلی چھال سے مچان کے چاروں طرف لکڑیوں کو باندھ کر ایک فریم سا بنایا۔ درمیان میں ڈنڈے باندھے۔ جب اس سے فارغ ہو گیا تو میں نے اس میں لگانے کے لئے چٹائیاں بنانے کی تیاری کی اور پورے ناپ کی چٹائیاں بنانی شروع کر دیں۔ دن بھر اسی میں مصروفیت رہی اور وقت خوب گذرا دوسرے دن دوپہر تک اس میں چٹائیاں باندھ کر فارغ ہو گیا چھت بھی چٹائیوں کی ڈال دی۔ درخت کے اوپر ایک نہایت عمدہ آرام دہ کمرہ بن گیا تھا پتوں ہی کا ایک تکیہ بھی بنا دیا اور اب یہ میرا گھر نہایت آسائش کا ہو گیا۔ لکڑی کی ایک سیڑھی بھی لگا دی اپنا کوٹ وپیٹی وغیرہ سب اسی کمرے کے اندر لٹکا دیئے اس گھر میں دروازہ نہیں لگایا گیا تھا۔

میری جیب اور خاکی قمیص شبانہ روز پہنے رہنے سے میلی ہو گئی تھیں۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کر میں نے اُن کو دھویا اور دھوپ میں پھیلا دیا۔ ضرورت انسان سے سب کچھ کرا دیتی ہے۔ جو کام میں نے کبھی نہ کئے تھے وہ یہاں

بڑی دلچسپی اور خوشی سے کر رہا تھا۔ اب شام ہو گئی تھی اور میرا وقت اس خوشی میں گزر رہا تھا کہ آج حسب وعدہ عبو ضرور آئے گا اور رہ رہ کر دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ وہ کس قدر مہذب ہے۔ ان وحشیوں میں رہنے کے باوجود اس میں ہمدردی اور ادب و لحاظ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ ضرور کسی شریف خاندان کا چشم چراغ ہے۔ اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس قید تنہائی میں عبو جیسے رفیق کو میرا ہمدرد بنا دیا ہے۔ ورنہ میری حالت جو کچھ نہ ہوتی کم تھی۔

رات گذرتی جاتی تھی اور میں جھیل کے کنارے اسی پتھر پر بیٹھا ہوا بے صبری کے ساتھ عبو کا انتظار کر رہا تھا۔ تھک جاتا تو اٹھ کر ٹہلنے لگتا اور پھر وہیں آکر بیٹھ جاتا۔ آخر چاند بھی نکل آیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھا گیا کہ جھیل میں کشتی آتی ہوئی نظر آجائے، لیکن وہ نہ آنی تھی نہ آئی۔ میں نے تمام رات بے چینی سے اٹھ بیٹھ کر گذاری، لیکن افسوس کہ عبو نہ آیا اور جس کا مجھے بڑا صدمہ رہا۔

۴ بجے صبح میں مایوس ہو کر مچان پر آیا اور لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا ۱۱ بجے تک سوتا رہا۔ پھر اٹھ کر چشمہ پر گیا، منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا اور حسب معمول ٹوپی اور لکھاڑی لے کر جزیرہ کے گشت کے لئے چلا گیا۔ آج مجھے لکڑی اور پتے کاٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں جزیرہ کے دوسرے کنارے پر جا کر دیر تک

بیٹھا ہوا وقت گزارتا رہا۔ جھیل کے اُس پار دور فاصلہ پر بلند پہاڑ اور جنگل نظر آرہے تھے۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم کو کس طرف کا سفر اختیار کرنا چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم جنگلوں میں بھٹکتے پھریں اور راستہ نہ ملے۔ میں اور میرے ہمراہی راستہ سے قطعی ناواقف ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ایک لکڑی سے اپنے سامنے زمین پر آفتاب کے طلوع و غروب کی سمت کے مطابق یورنیو کا نقشہ کھینچا۔ پھر اندازہ کیا کہ سارا واک اور کوچنگ اس حصہ میں ہوں گے اور میسیری کا یہ مقام ہو سکتا ہے۔ سارا واک کی بہ نسبت میسیری یہاں سے قریب ہوگی لہذا ہم کو میسیری ہی کی طرف کوچ کرنا چاہیئے۔ میسیری یہاں سے ڈیڑھ سو میل سے کم فاصلہ پر نہ ہوگی۔ اگر ہم نے ۱۵ میل روزانہ بھی سفر کیا تو ہم دس روز میں وہاں جا پہنچیں گے۔ اور اگر راستہ میں کہیں دریا میں ہمیں کشتی کی مدد مل گئی تو یہ سفر اور بھی جلد طے ہو جائے گا اور پھر میں نے اندازہ کیا کہ اگر ہم میسیری کی جانب سفر کریں تو آفتاب کے طلوع کے وقت ہماری پشت سورج کی سمت ہونی چاہیئے اور ہمارا رُخ قدرے شمال کی جانب۔

جنگلی درندوں سے محافظت کے لئے ہمیں چند مشعلوں کا بھی انتظام کرنا چاہیئے اس لئے کہ سب درندے آگ کے قریب نہیں آتے لیکن ہمارے پاس مشعل روشن کرنے کے لئے دیا سلائی وغیرہ نہیں ہے۔ اگر تین مشعلیں فراہم ہو جائیں

اور دیا سلائی کا بھی انتظام ہو جائے تو پھر اس سفر میں ہم کو درندوں کا کچھ زیادہ اندیشہ باقی نہ رہے گا اور ہم اُن کے خطروں سے ایک بڑی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔ ہم خود تو کسی درندے پر گولی چلائیں گے نہیں، کیونکہ ہماری غرض شکار کھیلنا نہیں بلکہ جنگل میں صرف اپنی جانوں کی حفاظت کرتا ہے۔
الحاصل میرے دل و دماغ میں فرار ہونے کے خیالات آ رہے تھے اور میں اُس کی تیاری کے لئے تجویزیں اور نقشے تیار کر رہا تھا۔ اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ جنگل میں مجھی کو رہبری کرنا پڑے گا۔

باب بارھواں

فرار

شام کے قریب میں وہاں سے واپس آیا۔ کچھ ناشتہ کیا اور مچان پر لیٹ گیا، آنکھ لگ گئی، سو کر اُٹھا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آج مجھے جُو کے آنے کی پوری اُمید تھی میں دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ ۱۱ بجے کے قریب میں مچان سے اُترا پستول

میری برجس کے جیب میں تھا۔ میں کنارے پر گیا اور دیر تک وہاں ٹہلتا عبو کا انتظار کرتا رہا۔ اب ۱۲ بج چکے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو وہیں جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ انتظار کی گھڑیاں بھی کس بلا کی ہوتی ہیں۔ بار بار میری نظر اٹھ اٹھ کر جھیل کے پانی پر دور تک پڑ رہی تھی۔ ماہتاب ہنوز نہ نکلا تھا صرف تاروں کی روشنی کچھ سہارا دیئے ہوئے تھی۔ ایک بجے کے قریب چاند کے طلوع ہونے کے اثرات نمودار ہوئے۔ عین اسی وقت اُس سناٹے کے عالم میں یکایک دُور پر عبو کی دلکش اور خوش آئند آواز سُنائی دی اور پھر کشتی بھی آتی ہوئی نظر آنے لگی۔ کچھ لمحہ بعد کشتی کنارے آ لگی۔ عبو نے ہاتھ بڑھا کر مجھے میری رائفل پکڑا دی اور پھر ایک جست میں کشتی سے کود کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

اُس نے مجھ پر یہ ایک احسان اور کیا کہ میری ضائع شدہ رائفل تلاش کر کے مجھے لا دی۔ رائفل کو دوبارہ اپنے قبضہ میں پا کر مجھے بڑی تقویت و مسرت ہوئی۔ میں نے فرطِ انبساط سے اُسے گلے لگا لیا اور اُس کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ رائفل کے کارتوس میری پیٹی میں کافی موجود تھے۔ میں عبو کے ہاتھ کو گرم جوشی سے تھامے ہوئے اپنے ڈیرے پر لے آیا۔ ہم دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ زماں بعد میں نے پھر دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! تم نے یہ سب سے بڑا کام کیا ہے جس سے مجھے بڑی تقویت پہنچی اور اُس سے پوچھا

کہ عبو! تم کل کیوں نہیں آئے؟ میں نے تمام شب تمھارے انتظار میں جھیل کے کنارے بڑی تکلیف سے کاٹی۔

اُس نے کہا کہ میں نے یہاں سے جانے کے بعد ہی آپ کی بتدوق کی تلاش شروع کر دی تھی جو مجھے مل گئی اور اُس کو میں نے اپنے قبضہ میں کر کے ایسی جگہ رکھ دیا کہ میں رات کے وقت آسانی سے آپ تک لاسکوں، لیکن میرے دو روز نہ آنے کا باعث یہ ہوا کہ میرے جانے کے بعد ہمارے ان جنگلیوں میں ایک ہنگامہ بپا رہا۔ پرسوں تمام دن اور کل رات کے ایک بڑے حصہ تک ان کی مجلس شوریٰ ہوتی رہی۔ بات یہ ہے کہ کم و بیش دو ماہ کا عرصہ ہوا کہ کائن قوم کے لوگوں نے اس گاؤں پر حملہ کیا تھا جن سے کئی دنوں تک لڑائی ہوتی رہی۔ نتیجہ میں کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے، جس کے بعد ہمارے جنگلی شکست کھا کر بھاگ گئے۔ کائنوں نے لوٹ مار کی اور کچھ مکانوں کو جلا کر تباہ و برباد کر دیا، چنانچہ یہ لوگ کائنوں سے انتقام لینے کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عنقریب ہی مع اپنے سردار کے لڑائی پر روانہ ہو جائیں گے جہاں غالباً وہ ایک ہفتہ تک مصروف رہیں۔ میں نے کہا۔ عبو! اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے، یہ فرار ہو جانے کا بہترین وقت ہے جس کا ہمیں بے صبری سے انتظار کرنا چاہیئے۔ لیکن کہیں ایسا تو نہ ہو

کہ یہ لوگ تمھیں بھی اپنے ہمراہ لے جائیں۔ اس نے کہا۔ ایسا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ لوگ لڑائی کے وقت اپنی قوم کے سوا اور کسی کو اپنا شریک نہیں بناتے۔ یہ سُنکر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ اللہ پاک نے غیب سے یہ صورت پیدا کردی ہے اور ہم اس سے فائدہ اُٹھاکر ضرور یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ کیا چند مشعلوں کا بھی انتظام ہوسکتا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ مشعلیں تو ہر جنگلی کے گھر میں موجود ہیں اور یہ لوگ رات کے سفر میں ہمیشہ اُسی سے کام لیتے ہیں۔ مجھے بھی یاد آگیا کہ ہاں بیشک میری گرفتاری کے وقت جنگل میں انکے ساتھ مشعلیں روشن تھیں۔ پھر اُس نے بتایا کہ جنگل میں ایک قسم کا درخت ہے جس کی لکڑی آگ جلد پکڑ لیتی ہے یہ سب اُسی کی لکڑی سے مشعلیں تیار کرتے ہیں اور اس ترکیب سے کہ اُس لکڑی کو لاکر ایک قسم کی باریک گھاس کو جو یہاں عموماً ہر جگہ ملتی ہے لکڑی کے سرے پر باندھ کر مشعل تیار کر لیتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو پتھر سے آگ جھاڑ کر اُسے روشن کر لیتے ہیں اور اس کے روشن کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی حتیٰ کہ میری دادی تو روزانہ اسی گھاس کو پتھر سے جلا کر اپنے اور میرے لئے کھانا تیار کر لیا کرتی ہیں۔ یہ سُنکر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا یہ دوسرا سوال بھی آسانی

سے حل ہوگیا۔ میں نے عبو سے جا کر روانگی سے قبل تم تین مشعلیں کچھ گھاس اور پتھر مجھے دے جاؤ اُن کے علاوہ مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور تم اپنے ہتھیار تو اپنے ساتھ لے ہی آؤ گے۔ عبو نے جواب دیا۔ بیشک۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلا گیا۔

اب دو ہفتے ہو چکے، عبو نے مشعلوں کا سامان بھی میرے پاس پہنچا دیا۔ انتظار تھا تو صرف یہ کہ کسی طرح یہ جنگلی لڑائی پر روانہ ہوں تو ہم بھی موقع پا کر یہاں سے فرار ہو جائیں شبانہ روز ان لوگوں کے دال، ف، عین ہونے کا خیال لگا رہتا تھا لیکن کل امر مرہون با وقتہا اسی انتظار میں دن گذرتے گئے۔

ایک دن صبح ہی سے آسمان ابر آلود تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور کسی قدر ترشح بھی ہو رہا تھا حتیٰ کہ تمام دن یہی کیفیت رہی اور شام ہوتے ہوتے چاروں طرف بادل گھر آئے۔ زور کی بارش شروع ہو گئی اس پر ستم یہ ہوا کہ ہوا کے تیز و تند جھونکے بھی چلنے لگے۔ میری پریشانی اور بدحواسی کی جو کچھ حالت تھی بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اس امر کا یقین تھا کہ میرا جھونپڑا اس طوفان باد و باراں میں درخت پر کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتا اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں کہاں جا کر پناہ لوں گا۔ درختوں کی یہ کیفیت تھی کہ ہر ہوا کے جھکڑ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب جڑ سے اکھڑے اور اب اکھڑے

اندھیرا اس غضب کا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا اُس پر بادلوں کی زور کی کڑک اور بجلی کی قیامت خیز چمک اور بھی زہرہ آب کئے دے رہی تھی، اور کیوں نہ زہرہ آب ہوتا جبکہ لوگوں کے دل آبادی کے اندر دھڑک اُٹھتے ہیں اور وہ خوف سے کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے ہیں اور پھر میں تو ایسے ویرانہ میں تھا کہ جہاں خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔

الغرض میں درخت پر اپنے مچان میں پڑا ہوا کے جھونکوں سے درخت کے ساتھ جھوم رہا تھا۔ پانی چٹائیوں کو چیرتا ہوا بے دھڑک اندر چلا آرہا تھا، اور میں بھیگ کر شرابور ہو رہا تھا۔ آخر اس قیامت خیز طوفان میں بے چارہ مچان کب تک قائم رہ سکتا تھا۔ چٹائیاں سب ایک ایک کرکے باتو ہوا میں اُڑ گئیں اور یا پانی سے بھیگ کر اور ٹوٹ کر نیچے آرہیں۔ میں درخت سے نیچے اُتر آیا اور اُسی جڑ سے آڑ لگا کر بیٹھ گیا۔ سردی سے سارا جسم ٹھٹھرا جا رہا تھا اور باوجود بے انتہا ضبط کے بھی بے اختیار دانت بولے جا رہے تھے۔ اگرچہ میں تکلیف و مصیبت اُٹھانے کا عادی ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس وقت کی تکلیف سے بیحد پریشان تھا کہ کوئی صورت بھی امان کی نظر نہ آتی تھی۔ طوفان اور بارش کا یہ حال تقریباً چھ سات گھنٹے مسلسل جاری رہا۔ اس کے بعد کم ہونا شروع ہوا، صبح تک یہ طوفان نہ تھا۔ دوپہر کے بعد کچھ دھوپ نکلی۔ میں نے اپنے کپڑے خشک کئے۔ چٹائیوں کو تلاش کرکے

لے آیا۔ اُن کی مرمت کی اور دوبارہ مچان کو درست کیا۔ رات بھر سردی اور ٹھنڈ میں پڑا رہا۔ دوسرے دن مجھے تیز بخار تھا۔ اسی حالت میں دو روز تک بھوکا پیاسا پڑا رہا، اس کے بعد کسی قدر طبیعت سنبھلی اور میں اُٹھکر اپنے معمول میں لگ گیا۔

کئی دن ہو گئے تھے عبو سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز میں مچان پر سو رہا تھا اور آفتاب کے طلوع ہونے میں ابھی کافی عرصہ تھا کہ کسی نے مجھے گدگدا دیا۔ میں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ عبو میرے پاس بیٹھا ہوا مسکرا رہا ہے۔ میں اُٹھکر بیٹھ گیا۔ مچان کے باہر دیکھا تو سپیدہ سحر نمودار ہو چلا تھا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ عبو! تم آج یہاں صبح کے وقت کیسے؟ اُس نے جواب دیا کہ آج تمام رات ہمارے یہاں ایک طوفان بے تمیزی مچا رہا۔ سب جنگلی لڑائی کی تیاریاں کیا کئے اور ۴ بجے کے قبل ہی اپنے سردار کو لے کر روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر میں نے انتظار کیا کہ مبادا ان کا کوئی آدمی پھر کوئی سامان لینے کے لئے واپس نہ آجائے اور اس طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں موقع کو غنیمت سمجھکر ادھر چلا آیا گاؤں کے بقیہ لوگوں کو میرے یہاں آجانے پر کسی قسم کا شبہہ نہ ہوگا اور وہ یقینی یہ خیال کریں گے کہ ہم بھی سردار کے ساتھ ہیں اور اسی مغالطہ میں وہ تلاش بھی نہ کریں گے۔ میری رائے میں یہ ہمارے فرار ہو چلنے کا بہترین

واقعہ یہ ہے اس مسرت افزا اطلاع سے میرے دل کو جو کچھ فرحت ہوئی بیان نہیں کر سکتا۔

میں نے انتہائی مسرت اور جوش میں کہا کہ بھائی! تم نے غلطی کی تمھیں اپنی دادی کو بھی ہمراہ لے آنا چاہیے تھا کہ ہم یہیں سے بالا بالا نکل چلتے۔ اُس نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیے میں اُنھیں لیتا آیا ہوں اور وہ نیچے چٹائی پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہ سنتے ہی میں نیچے اُترآیا۔ عبو بھی میرے ساتھ تھا۔ اُسکی دادی مجھے دیکھکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے سلام علیک کہا اور تعظیم پہ سر اُس کے سامنے جھکا دیا۔ اُس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کچھ دعائیں دیں اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے سر کو قریب کرکے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کے بعد ہم سب چٹائی پر بیٹھ گئے۔ دادی گو عمر رسیدہ تھی لیکن خوب تندرست تھی۔ سر کے بال اگرچہ سفید ہو گئے تھے لیکن چہرہ پر ایک رونق و تمکنت اب تک باقی تھی۔ اسی طرح قوائے جسمانی بھی کافی مضبوط نظر آرہے تھے۔ دادی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ بیٹا! وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟ ہم لوگوں کو یہاں سے جلد روانہ ہو جانا چاہیئے۔ میں نے کہا۔ ہاں! یہ درست ہے، لیکن بہتر ہوگا کہ ہم لوگ روانگی سے قبل یہاں اچھی طرح ناشتہ کرلیں تاکہ ہم بہ اطمینان اپنا سفر جاری رکھ سکیں اور اگر شام تک ہمیں راہ میں خدانخواستہ کچھ کھانے کے لئے میسّر نہ بھی آئے تو چنداں باعث تکلیف

عبو۔ چنانچہ میں جلدی سے اُٹھ کر گیا اور کٹہل وانا س سے آیا۔ پھر انھیں چاقو سے تراش کر چشمہ کے کنارے ایک صاف پتھر پر رکھدیا۔ عبو کی دادی اپنے ساتھ بھُنے ہوئے چاول اور بھُنا ہوا گوشت لے آئی تھی۔ ہم سب نے ملکر کھایا۔ پھر اس سے فارغ ہوکر میں فوراً تیار ہوگیا۔ پیٹی۔ پستول سنبھال کوٹ پہنا، پتّوں کی بنائی ہوئی ٹوپی سر پر رکھی۔ رائفل و کلھاڑی ہاتھ میں لی۔ تینوں مشعلیں عبو نے اُٹھالیں۔ گھاس اور پتھر البتہ اس لئے چھوڑ دیئے کہ یہ چیزیں عبو کی دادی کے تھیلے میں موجود تھیں، اپنے محنت سے بنائے ہوئے مچان پر ایک آخری نظر ڈالی اور خدا کا نام لے کر ہم روانہ ہوگئے۔ جھیل پر پہنچکر ہم نے اپنا سامان کشتی میں رکھا اور کشتی کے رُخ کو جنوب کی طرف پھیر دیا تاکہ کشتی اُس پار جنگلیوں کے گاؤں سے دور فاصلہ پر جا لگے۔ ایک گھنٹہ میں ہم اُس پار پہنچ گئے۔ خشکی پر اُتر کر میں نے ایک مضبوط رسّی سے رائفل کو باندھ کر اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔ کلھاڑی اور ایک مشعل ہاتھ میں لے لی۔ عبو نے تیر و کمان کندھے پر لگائے اور نیزہ و مشعل ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُس کی دادی نے تھیلے کو بغل میں دبایا، کچھ رسّیاں کمر میں لپیٹیں اور ایک ہاتھ میں مشعل کی لکڑی لے لی۔ اس طرح تقریباً ۸ بجے جبکہ آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا ہم اس کی طرف پُشت کرکے مغرب جانب رُخ کئے ہوئے خدا کے بھروسہ پر چل کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم گھنے جنگل میں تھے۔

باب تیرھواں

جنگلوں میں سفر

بے پایاں سمندر کی طرح لق و دق صحرا اور گھنے جنگل اب ہمارے سامنے تھے، ہم اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لئے ہوئے اس خطرناک جنگل میں گھس گئے ہم کو اپنی گرفتاریوں کا کوئی اندیشہ تھا اور اطمینان تھا کہ اگر بالفرض اُن وحشیوں نے ہمیں تلاش بھی کیا تو ہم یہاں اُن کے دسترس سے پوری طرح محفوظ رہینگے البتہ اس دہشت ناک جنگل میں درندوں کا خطرہ ہر آن تھا خصوصاً اورنگ اوٹن بن مانس سے دوچار ہو جانے کا سب سے بڑا اندیشہ تھا۔ میرا قیاس تھا کہ ہمارے لئے یہاں تین چار دن زیادہ خطرناک ہیں پھر انشاء اللہ ہم اس وحشتناک اور گھنے جنگل کو عبور کر جائیں گے اور ایک بڑی حد تک بن مانس کے حملوں کا خطرہ جاتا رہے گا البتہ اس تین چار دن کے سفر میں ہر لمحہ زندگی و موت کا سوال ہے، خاصکر اس حیثیت سے کہ میرے ہم سفر قطعی ناتجربہ کار ہیں اور ضرورت کے وقت مجھے اُن سے ذرا بھی مدد ملنے کی توقع نہیں ہے۔

ہم تیز قدمی سے چلنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن پہاڑ کی چڑھائی

اُترائی، پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے اور جھاڑیاں ہمارے راہ میں آ آکر حائل ہوجاتے تھے۔ اس وقت ہم کوہ موٹو کی بلندیوں اور اُس کے جنگلوں میں سے ہوکر گذر رہے تھے۔ ہمیں اپنی آزادی کی بے انتہا خوشی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ہر قدم پر جان کے لالے بھی پڑے تھے۔ ہرن، جنگلی سور اور بندر بکثرت غول کے غول سامنے سے گزرتے رہتے تھے۔

دو گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم ایک بلند پہاڑی پر پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم نے نشیب میں میدان کی جانب نظر کیا تو درختوں کے اندر سیکڑوں ریچھ اور دیگر درندے ہم کو چلتے پھرتے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا جنگلی درندوں میں کوئی جشن یا تہوار منایا جا رہا ہے۔ جانوروں کا کچھ شمار نہ تھا اور دور تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ انسانی آبادی میلوں نہ نظر آرہی تھی۔ جانوروں کی یہ کثرت دیکھ کر ہم خوف زدہ ہوگئے۔ لیکن ہم آگے بڑھنے پر مجبور تھے۔ پہاڑ کے اُوپر ہی اُوپر ہم دور تک جانے کے بعد نشیب میں اُترے اور اسی حصہ کو بہ عجلت طے کر رہے تھے کہ ہمارے سامنے پھر بلندی آگئی۔ ابھی اس پر چڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ داہنی جانب کی پہاڑی سے کسی بڑے جانور کے اُترنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ ہم نے سر اُٹھا کر دیکھا تو جنگلی بیل نظر آئے جو بڑی تیزی سے اسی طرف آرہے تھے۔ ہمارے سامنے بلند پہاڑی تھی جس کو ہم جلد طے نہ کرسکتے تھے۔ ہم نے فوراً درختوں پر چڑھ جانے کا

ارادہ کر کے پہلے بڑھیا کو اُٹھا کر درخت پر بٹھا دیا پھر ہم دونوں بھی جلدی سے اُچک کر درخت پر چڑھ گئے۔ وہ سب بیل بلندی سے گھاس چرتے ہوئے نشیب کی طرف آ رہے تھے اور اب وہ ہم سے بہت ہی قریب تھے۔ اُن کے بالکل سامنے آ جانے پر ہم نے ان کا شمار کیا تو یہ گائیں اور بیلوں کو ملا کر کم و بیش پچیس تیس کا ایک غول تھا۔ ان کی سانسوں کی پھنکاروں کی آوازیں دور سے سنی جا رہی تھیں۔ یہ جنگلی بیل اور گائیں یہاں کے جانوروں سے شکل و صورت میں بالکل جداگانہ تھے۔ بیلوں کے سینگ بہت بڑے بڑے اور پھیلے ہوئے تھے، رنگ ہلکا بھورا اور آنکھیں نہایت روشن اور خوب بڑی بڑی بعینہٖ افریقہ کے جنگلی بھینسوں کی مانند۔

تقریباً ایک گھنٹہ کامل ہم خاموش درختوں پر بیٹھے رہے۔ ریچھ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہمارے سامنے سے گزرتے رہے۔ یہ غول چرتا ہوا ہم سے دور نکل گیا۔ قرینہ کہتا تھا کہ وہ دریا کی طرف چلا گیا۔ ہم نے درختوں سے اُتر کر پہاڑی کو جلد طے کر لینے کی کوشش کی۔ ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ کچھ فاصلہ طے کر لینے کے بعد اچانک قریب کی جھاڑیوں سے ایک بڑے جنگلی سور نے نکل کر ہم پر حملہ کر دیا۔ عبّو بال بال بچ گیا، لیکن اس کے قریب پہنچتے ہی عبّو نے اُس کی گردن پر نیزہ کا وار کیا اور پھر پھرتی سے درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ میں نے بھی اس کے سر پر پستول کے دو فائر کئے جس سے

وہ زخمی ہو کر کچھ دور تک چلا گیا، مگر پھر ہماری طرف تیزی سے پلٹا۔ اب میں رائفل طیار کر چکا تھا اور قبل اس کے کہ وہ ہم تک پہنچے میں نے ایک گولی اُس کے دماغ پر لگا دی، جس سے وہ وہیں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس سے مطمئن ہو جانے کے بعد ہم آگے روانہ ہو گئے۔ ایک مناسب جگہ پر تھوڑی دیر دَم لینے کے لئے ٹھہر گئے اور پھر وہی ہم تھے اور وہی ہماری منزل۔

پہاڑی نشیب و فراز، گہرے نالے، خندق اور درّوں کی منزلیں مارتے ہوئے ہم بدستور بڑھے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک مقام پر پہنچ کر جب ہم نے بلندی سے نشیب میں اُترنے کا قصد کیا تو اُسی نشیبی حصہ سے قریب ہی کسی درندے کے بولنے کی خوفناک آواز سُنائی دی۔ ہمارے قدم جس مقام پر تھے وہیں رُک گئے اور ہم متجسّس نگاہوں سے اُسی سمت دیکھنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ آواز کس جانور کی ہے لیکن ہاں اس سے اطمینان تھا کہ یہ آواز بنی مانس کی نہ تھی۔ اتنے میں وہ جانور پھر زور سے بولا۔ اور اب مجھے خیال آیا کہ یہ آواز تو میں نے شمالی بورنیو کے جنگلوں میں سُنی تھی، ہو نہ ہو یہ بورنیو کے مشہور جانور ٹیپر کی ہے۔ اس وقت شام کے چار بج چکے تھے اور ہم خستہ ہو کر بالکل تھک گئے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ رات کسی بلند مقام پر بسر کرنی چاہیئے اس لئے کہ جنگل میں عموماً بلندی کی

نسبت نشیب میں زیادہ خطرات ہوتے ہیں اور ہر درندے کا رُخ شب کے
وقت کھلی ہوئی جگہ کی طرف ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم کچھ بلندی
پر واپس لوٹ آئے۔ ایک مقام پر پہاڑ سے آبشار گر رہا تھا، اُس کے
قریب بیٹھ کر ہم نے ناشتہ کیا۔ اس سے فارغ ہو کر کلہاڑی سے لکڑیاں
کاٹ کر دو درختوں پر جو باہم ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے ہم نے مچان
تیار کئے۔ پھر میں نے اور عبو نے اُس کی دادی کو سہارا دیکر اوپر پہنچایا۔ عبو
ہنوز میرے پاس نیچے ہی تھا۔ آخر میں نے اُس سے کہا کہ شام ہو گئی ہے
تم تھکے بھی ہوئے ہو اب جا کر اپنی دادی کے پاس لیٹ رہو۔ لیکن
اُس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ آخر آپ بھی تو ہمیں لوگوں کی خستہ و
چو رہو رہے ہیں اور آپ کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔ مگر جب میں نے
زیادہ مجبور کیا تو وہ میرے اصرار کو دیکھ کر بادلِ ناخواستہ اپنی دادی
کے پاس اوپر چلا گیا اور وہاں سے رہ رہ کر بار بار مجھے بھی مچان پر
چلے آنے کے لئے زور دیتا رہا۔

شام ہوتے ہی سارا جنگل جانوروں کی طرح طرح کی آوازوں سے
گونج گیا، ہر طرف قیامت کا شور و ہنگامہ بپا تھا۔ کان پڑی آواز نہیں
سنائی دے رہی تھی۔ شیروں کے دھاڑنے، بھیڑیوں کے بولنے اور بن مانس
کی دور کی کرخت آواز سب مِل ملا کر دل دہلائے دے رہی تھیں۔ اندھیرا

چاروں طرف پھیل چکا تھا، جگنو چمک رہے تھے۔ غرض اس وقت جنگل کا یہ سین ایک نہایت ہی بھیانک اور خوفناک نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ عبّو کی دادی پر خوف نہ طاری ہو، شکار کے حالات اُن سے بیان کرنے شروع کر دیئے، اور بتلایا کہ یہ آواز جو قریب سے آ رہی ہے، یہ ٹیپر کی ہے۔ میں نے شمالی بورنیو میں اس کا شکار کیا ہے۔ یہ جانور گینڈے کی قسم کا ہوتا ہے اور کچھ زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

دیر تک شکار اور درندوں کا ذکر کرتا رہا۔ ۱۱ بجے کے قریب دونوں سو گئے لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ دیر کے لئے سو جاؤں تو بہتر ہے تاکہ دوسرے دن کے سفر کے لئے تازہ دم ہو سکوں۔ مجھے اس جنگل میں شیر کا اتنا خوف نہیں تھا جتنا بن مانس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا تھا اور اصل میں مشعلوں کا انتظام انھیں کمبختوں کے لئے میں نے کیا تھا۔

رات کا کچھ حصہ گزر جانے کے بعد مجھے بھی نیند آنے لگی، مگر آنکھ بار بار کھل جاتی تھی، اس لئے کہ مجھے جانوروں کی آوازوں کی وجہ سے اطمینان حاصل نہیں تھا، حالانکہ یہ آوازیں میرے لئے نئی نہ تھیں اور میرے کان ان سے

پہلے سے آشنا تھے۔

آدھی رات کے بعد دفعتاً ایک زور کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بغور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دیکھا تو سامنے کی بلندی پر سے دو چیتے (پینتھر) آپس میں کھیلتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ وہ دونوں ہمارے درختوں کے نیچے آ گئے۔ چاند کی دھیمی روشنی درختوں کے پتوں میں سے چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی۔ ادھر مچان سے عبو کی دادی کے خراٹے کی آواز بھی برابر جاری تھی۔ دونوں چیتے اب یہیں کھیلنے لگے کچھ دیر بعد ایک چیتے نے دادی والے درخت پر چڑھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ تھوڑی بلندی تک جانے کے بعد وہ نیچے اُتر آیا اور پھر دونوں آپس میں کھیلنے لگے۔ رائفل میرے پاس بھری ہوئی رکھی تھی مگر میں اس انتظار میں تھا کہ جب کوئی خاص خطرہ پیش آئے یا یہ درخت پر چڑھ کر مچان کے قریب پہنچے تو فائر کروں، یوں کارتوس ضائع کرنے سے کیا حاصل؟ اتنے میں ایک چیتے نے آخر خراٹے کی آواز سُنکر اُوپر چڑھنا شروع ہی کر دیا میرا خیال تھا کہ اس مرتبہ بھی وہ پہلے کی طرح درخت پر کچھ دُور چڑھ کر اُتر جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ بالکل مچان کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے رائفل اُٹھا کر ایک گولی اس کے دماغ پر دی، جس کے لگتے ہی وہ نیچے گر پڑا۔ فائر کی آواز سے وہ دونوں دادی، پوتے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیچے جھک کر

دیکھا تو ایک چیتا دم توڑ رہا تھا، دوسرا اُس کے سر پر کھڑا تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ اُس کا ساتھی یہاں سے جلد نہ ہٹے گا ایک گولی اُس کے سینہ پر بھی داغ دی جس سے وہ بھی اُس کے قریب ہی لیٹ گیا اور تھوڑی دیر میں دونوں ختم ہو گئے۔ رات کا باقی حصہ ہم نے اسی طرح گذارا کہ کبھی آنکھ لگ جاتی تھی اور کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ آخر صبح ہو گئی۔ وحشتناک جنگل پُرامن نظر آنے لگا۔ میرے ہمراہی اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے خدائے پاک کے حضور میں ایک دن اور ایک رات اس خوفناک جنگل میں بخیریت گزر جانے پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ دھوپ نکل آنے پر ہم لوگ مچان سے اُترے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر پانی کے قریب گئے وہاں ناشتہ کیا۔ پھر مچان سے رسّیاں کھولیں۔ سب سامان درست کیا اور اپنی راہ لی۔

منزل ہمارے سامنے نہایت دشوار گذار تھی۔ جھاڑیاں عمیق خندقیں، پہاڑ کی چڑھائی اُترائی، ندی، نالے سبھی تھے جنھیں ہم طے کرتے ہوئے قدم اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔ ۹ بجے کے قریب ہمارا گذر ایک پہاڑ کے دامن سے ہوا جہاں ہم نے دیکھا کہ بہت سے سانبھر جن میں نر و مادہ دونوں ہیں سامنے کھڑے ہیں اور قریب ہی ریچھ کے دو چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماں کے ساتھ آہستہ آہستہ جا رہے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کیلئے وہاں رُک گئے اور جب وہ دور پہنچ گئے تو پھر ہم روانہ ہو گئے۔

جوں ہی ہم اس پہاڑ کے موڑ سے گذر کر ایک تنگ درّہ کے راستہ سے باہر پہنچے تو اچانک ہم ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے یعنی دس پندرہ ریچھوں نے جو وہاں جنگلی پھل کھا رہے تھے ہم پر دھاوا بول دیا۔ کچھ درختوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے رائفل سنبھال کر اُن پر فائر کرنے شروع کر دیئے۔ عبّو نے تیر برسائے اور اُس کی دادی جلدی سے ایک مشعل جلا اُن پر ٹوٹ پڑی۔ غرض ہم لوگوں نے بلا خوف و ہراس کے اُن کا مستعدی اور سختی سے مقابلہ کیا۔ میں نے گولیوں سے تین ریچھوں کا کام تمام کیا۔ عبّو نے متعدد زخمی کئے اور ان زخمیوں میں سے جب دو اُس پر جھپٹ پڑے تو اُس نے اُنھیں اپنے نیزے پر رکھ لیا۔ درختوں سے جو ریچھ اُتر رہے تھے میں نے اُن کی بھی گولیوں سے خبر لی لیکن وہ چلّاتے ہوئے سر پہ پیر رکھکر بھاگے اور اپنی جانیں سلامت لے گئے۔ پانچ بھالو ہمارے ہاتھوں کھیت رہے اور بہت سے زخمی ہو کر بھاگ گئے۔ اب ہمارے لئے راستہ صاف تھا۔ ریچھوں کی معرکہ آرائی میں ہم زخمی تو نہیں ہوئے ہاں پسینہ میں تر بتر ضرور ہو گئے۔ عبّو اور اُس کی دادی اس جنگ کے نتیجہ سے بہت محظوظ نظر آ رہے تھے لیکن ساتھ ہی اس کے حیران بھی تھے کہ کس طرح اُنھیں گولیوں سے مار کر گرا دیا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھیں کبھی بندوق کو اس طریقہ سے چلتے ہوئے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اب ایک بڑی حد تک اُن کے دلوں پر جو جنگلی درندوں کی دہشت تھی

وہ کم ہو گئی تھی۔

اب ہم پھر روانہ ہو کر دشوار گذار گھاٹیوں اور راستوں کو طے کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ یکایک بن مانس کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ گو آواز دُور سے آ رہی تھی مگر اُس کے کرخت آواز سے چیخنے سے تمام پہاڑ اور جنگل گونج رہے تھے جس سے دہشت پیدا ہو رہی تھی۔ ہم نے فوراً اپنا رُخ ذرا شمال کی طرف کر لیا تاکہ ہم اُس سے اور دور ہو جائیں۔ آدھ گھنٹہ بعد ہمیں ایک بڑے درخت پر کوئی بڑا سیاہ رنگ کا جانور نظر آیا۔ معاً ہم کو شبہہ ہوا کہ یہ بن مانس ہے اور ساتھ ہی اندیشہ ہوا کہ یہ ضرور ہم پر حملہ کرے گا۔ میں نے چاہا کہ مشعلیں روشن کر دی جائیں پھر ہم نے دیکھا کہ وہ ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ اب ہم کو خوف پیدا ہو گیا اور خیال ہوا کہ ان سے جان بچانی بہت مشکل ہے۔ مگر ہمارا یہ خوف بہت جلد جاتا رہا جب ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ یہ بن مانس نہیں بلکہ ہمارے قدیم کرم فرما جناب ریچھ صاحب ہیں، وہ ہمیں دیکھتے ہی ہماری مزاج پرسی کے لئے لپکے اور بالکل قریب آ کر دونوں پیروں پر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے وہ معانقہ کرنا چاہتے ہی تھے کہ مجھے اُن کی یہ تکلیف فرمائی گوارا نہ ہوئی اور میں نے رائفل کی گولی ایک صاحب کے سینہ میں پہنچا کر اُن کی تواضع کر دی جس سے وہ لمبے لمبے لیٹ گئے پھر عبو نے بھی اُنھیں اپنے نیزے کی صفائی کا ہاتھ دکھایا، اس کو دیکھتے ہی وہ ایسا مطمئن ہوئے کہ اُنھوں نے پھر آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا اور ہمیشہ کیلئے

خوابِ استراحت فرمالیا۔ دوسرے بزرگوار کی مزاج پرسی اگرچہ گولی سے درخت ہی پر کرلی گئی تھی لیکن پھر بھی وہ ایسا ناراض ہوئے کہ درخت سے کودتے ہی بعینہٖ اسی طرح غائب ہوگئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ان سے فراغت پاکر ہم نے پھر اپنا راستہ لیا اور شام ہو جانے پر رات درختوں کی بلندی پر مچان بناکر بسر کی۔

اسی طرح چار روز مسلسل ہم نے اس دہشت ناک جنگل میں سفر کرکے گذارے اور قدم قدم پر صعوبات و مشکلات سے دوچار ہوا کئے لیکن اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہر موقع پر ہماری دستگیری فرمائی اور ہمیں زندہ وسلامت رکھا۔ پانچویں دن ہم اس سخت و دشوار گذار منزل کو طے کرچکے تھے اور اب ہمارے سامنے صرف معمولی نالے، ندیاں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ ۱۱ بجے کے قریب ہم نے ایک ہرن کا شکار کیا اور ایک ندی کے کنارے لاکر خشک لکڑیاں جمع کیں پھر عنبو کی دادی نے آگ بناکر اس کے گوشت کو بھون لیا۔ پانچ دنوں کی پریشانیوں کے بعد آج ہم کو قدرے اطمینان نصیب ہوا تھا، ہم نے خوب شکم سیر ہوکر کھایا۔ بڑی بی نے کچھ بھنا ہوا گوشت اپنے تھیلے میں بھی رکھ لیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر ہمارے قدم پھر منزل پر پڑنے لگے۔ تین بجے کے قریب جنگل کو عبور کرکے ہم ایک بلند مقام پر پہنچے جس کے دامن میں کامن قوم والوں کی ایک چھوٹی سی بستی

نظر آئی۔ گو ابھی دن کا بہت سا حصہ باقی تھا، لیکن گذشتہ پانچ دنوں کے سفر سے ہم خستہ حال ہو رہے تھے لہذا یہ طے کیا کہ آج اسی بستی میں آرام کیا جائے۔

مسافر نوازی جنگلی لوگوں میں بھی ہے، وہ بخندہ پیشانی پیش آئے اور ہمارے لئے ایک صاف جگہ خالی کر کے وہاں چٹائی بچھا دی۔ ہم لوگوں نے اس پر لیٹ کر دیر تک آرام کیا۔ جبو اور بڑی بی اُن کی زبانوں سے واقف تھے۔ اثنائے گفتگو میں اُن لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہاں سے دس میل کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا دریا ہے اُس کے اس جانب اکثر مقامات پر خطرناک دلدل ہیں جنکے نزدیک سفر کرنا اندیشہ سے خالی نہیں اور ایک سمت ہاتھ کے اشارہ سے بتلایا کہ دریا کے اس طرف ایک بستی ہے، آپ لوگ وہاں جائیے بستی والے آپ کو دریا کے پار پہنچا دیں گے اور پھر آپ کے لئے سفر آسان ہو جائے گا۔

رات ہم نے بڑے آرام سے بسر کی۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی ہم اُس بستی کی جانب روانہ ہو گئے اور دوپہر ڈھلتے ہی ہم بستی میں جا پہنچے جہاں ہم نے قیام کر دیا۔ یہاں کے لوگوں سے یہ معلوم ہو کر مجھے تقویت ہوئی کہ دریا کے اُس پار تقریباً ۲۰ میل کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا شہر ہے مگر یہ لوگ اُس کا نام صاف طور پر نہ بتلا سکے۔ میں یہ جانتا تھا کہ یہ سارا علاقہ ریاست بہار میں ہے اور یہ سب جنگلی قومیں ریاست کی رعایا ہیں۔ اب ہم قریب قریب

تمام خطرات سے محفوظ تھے۔ عبو اور اُس کی دادی اپنی آزادی اور بعد مدت وطن میں واپسی پر بے انتہا مسرور تھے۔ میں اُن کا اور وہ میرے بہت ممنون احسان تھے۔ بڑی بی دعائیں دیتی اور بار بار کہتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں آپ کو صرف ہماری امداد اور رہائی ہی کے لئے بھیجا تھا ورنہ ہماری رہائی کی کوئی صورت نہ تھی۔ خدائے پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مصیبت اور پریشانی کے ۶ سال کی طویل قید کے بعد اب ہمیں آزادی اور رہائی عطا فرمائی۔ عبو کے سچے خلوص و محبت کی تو یہ کیفیت تھی کہ وہ کسی طرح الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی۔ یہ رات بھی ہم نے ان جنگلیوں کی بستی میں نہایت آرام سے گزاری دوسرے دن ان لوگوں نے ہمیں ایک کشتی کے ذریعہ سے دریا کے پار پہنچا دیا۔

یہاں سے روانہ ہونے کے بعد ہم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شام تک اُس بڑے شہر میں پہنچ جائیں مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ شام کو ۵ بجے کے قریب ہم ایک بستی میں پہنچے اور وہاں قیام کیا۔ اب یہ تمام جنگل آباد تھے۔ جا بجا بستیاں تھیں، فارم تھے اور لوگ چلتے پھرتے اور کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر ایک بڑا دریا تھا جس کو دریائے ٹنجا کہتے ہیں یہ کچھ دور بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ وہ بڑا شہر جہاں ہم جا رہے تھے ریاست سارا واک کا شہر رشہر کھرو ٹن تھا جو یہاں سے ۵ میل کے فاصلہ پر لب دریائے ٹنجا اُس پار واقع ہے۔

ہمارے پاس اب جو زائد اور بیکار سامان تھا مثلاً تیر، کمان، نیزہ، کلہاڑی بڑی بی کا تھیلا اور رسّے وغیرہ وہ سب ہم نے ان گاؤں والوں کو دیدیئے۔ دوسری صبح کو ہم روانہ ہوکر ۲ میل کا سفر طے کرنے کے بعد دریا کے کنارے پہنچ گئے جہاں ہم کو ایک ڈیک کی کشتی مل گئی جس نے ایک ڈالر کرایہ لیکر ہمیں دریا کے راستہ سے کلوڈٹون پہنچا دیا۔ بیرونی سے چلتے وقت میں نے احتیاطاً ۲۰۰ ڈالر کے نوٹ اور کچھ نقد ڈالر جیب میں رکھ لئے تھے کہ شاید شکار میں کہیں ان کی ضرورت پڑ جائے، مگر جنگل میں کہیں ان کی ضرورت نہ پڑی اور وہ جوں کے توں بدستور رکھے رہے۔ دس بجے کے قریب ہم شہر میں پہنچ گئے۔ کشتی سے اُتر کر ہم قریب ہی کے ایک اسلامی ہوٹل میں گئے اور وہاں بالائی منزل کے ایک کمرہ کو کرایہ پہ لے کر ٹھہر گئے۔ میں عبو اور اُس کی دادی کو ہوٹل میں چھوڑ کر سب سے پہلے حجام کی دُکان پر گیا۔ حجامت بنوائی۔ پھر درزی کی دُکان پر آیا۔ دو سوٹ۔ قمیصوں اور پائجاموں کا آرڈر دیا۔ اُس نے دوسرے روز تیار کر دینے کا وعدہ کیا۔ یہ سوٹ میں نے اپنے اور عبو کے لئے تیار کرائے تھے۔ بڑی بی کے لئے میں نے دو عدد ملائی طرز کی پھولدار رنگین چادریں خریدیں۔ میں ننگے سر تھا اپنے لئے ایک خاکی ہیٹ بھی خریدلی۔ پھر ہوٹل واپس آگیا اور غسل خانہ میں جاکر خوب نہایا۔ عبو اور اُس کی دادی غسل سے فارغ ہو چکے تھے۔

۱۲ بجے کے قریب ہم نے ہوٹل سے کھانا منگوایا۔ مدت بعد آج ہم نے انسانی کھانا تہذیب کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھایا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم برآمدہ میں آکر آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ سہ پہر کو ناشتہ اور کافی آئی۔ رات کے کھانے کے بعد ہم نرم بستروں پر جا کر لیٹ رہے اور رات بھر خوب سوئے۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد میں بازار گیا۔ درزی کے یہاں سے کپڑے لایا۔ عبّو کی فرمائش کے مطابق سر پہ باندھنے کے لئے ایک بڑا سیاہ ریشمی رومال لیا۔ اپنے لئے سگار بکس۔ موزے اور رومال وغیرہ خریدے۔ میرا بوٹ ٹوٹ چکا تھا۔ نیا بوٹ اور سلیپر لی۔ عبّو اور اس کی دادی ننگے پاؤں تھے اُن کے لئے بھی جوتے خرید لایا۔ آج نئے کپڑے پہنکر وہ شریف انسان معلوم ہو رہے تھے۔ عبّو نے ریشمی رومال غالباً عربی النسل ہونے کی وجہ سے پسند کیا تھا جس نے اس کی خوبصورتی میں اور بھی چار چاند لگا دیا۔ میں نے بھی اپنا سوٹ پہن لیا۔

یہاں سے میسیری تک پختہ سڑک تھی۔ شام کے وقت میں نے سواری کا انتظام کر لیا اور دوسرے دن صبح ہم روانہ ہو کر شام کو میسیری پہنچ گئے۔ میسیری میرے لئے نئی جگہ نہ تھی۔ امریکن ہوٹل میں جہاں میں پہلے ٹھہر چکا تھا جا کر ٹھہر گیا۔

میسیری سے شمال میں ریاست برونی بہت قریب تھی اور بنٹالو جنوب میں

دوروز کی مسافت پر ریاست سارا واک میں سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ اس وقت میں عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔ ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ میں برونی جلد سے جلد پہنچ جاؤں اور معلوم کروں کہ عنایت کا کیا حشر ہوا، آیا عزیب زندہ وسلامت ہے یا جنگلیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ جس کی مجھے بڑی تشویش لاحق تھی۔ دوسری جانب یہ بات بھی تھی کہ میں عبوؔ اور اُس کی دادی کو راستہ میں یوں نہیں چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ جب میں نے بڑی بی سے برونی جانے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے اس کو منظور نہ کیا اور عبوؔ بھی آبدیدہ ہو کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ لوگ مجھے بنٹالو تک اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے گھر کی مطلق خبر نہ تھی کہ اس ۶ برس کے عرصہ میں وہاں کی کیا حالت ہے اور عبوؔ کے دادا زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ کنبہ کی بربادی کے بعد اُن کا کیا حشر ہوا۔ اس کے علاوہ عبوؔ کے احسانات اور اُس کی ہمدردی بھی مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں اس کو اُس کے مکان پر بعافیت پہنچا دینے کے بعد برونی جانے کا قصد کروں۔ راہ میں ان کو چھوڑ دینا بالکل انسانیت سے بعید ہے۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ انھیں بنٹالو میں ان کے مکان پر پہنچا دینے کے بعد برونی جاؤں گا۔ میرے اس فیصلہ کو سنکر دونوں خوش ہو گئے۔ میں نے بنٹالو جانے کیلئے رات ہی کو کشتی کا انتظام کر لیا۔ سٹیمر کے آنے میں دیر تھی۔ دوسرے دن صبح ہم ناشتہ

سے فارغ ہو کر مسیری سے روانہ ہو گئے۔

باب چودھواں

حیرت انگیز انکشاف

ہمارے جہاز کو ہوا موافق مل گئی۔ چنانچہ ہم دوسرے دن شام کے ۳ بجے کے قریب بٹالو کے بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ خشکی پر قدم رکھتے ہی عبو اور اس کی دادی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ دونوں بیحد بے قرار و بے چین تھے۔ میں انھیں قریب ہی کے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ان کے منھ ہاتھ دھلوا کر انھیں تسلی و تشفی دی۔ ناشتہ اور کافی منگوائی۔ عبو کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے دادا کا نام شیخ ابوبکر ہے اور وہ یہاں کے مشہور تاجر ہیں۔ میں ان دونوں کو ہوٹل میں چھوڑ کر بازار گیا۔ وہاں دریافت کرتا ہوا شیخ ابوبکر صاحب کی دوکان پر پہنچا۔ یہ کپڑے کی ایک بڑی دکان تھی۔ دوکان میں دو شخصوں کو بیٹھا ہوا پایا۔ ان میں ایک ملائی تھا اور دوسرا عرب نوجوان۔ میں دوکان کے اندر کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کو کس قسم کے کپڑے کی ضرورت ہے؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے

کپڑے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شیخ ابوبکر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ سُنکر وہ عرب نوجوان میرے قریب کرسی پر آ بیٹھا۔ اور پوچھا کہ آپ کو اُن سے کیا کام ہے؟ میں نے کہا آپ ازراہِ کرم مجھے اُن کے پاس لے چلیئے، مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے اُنھیں کی خدمت میں کروں گا۔ اُس نے کہا کہ وہ میرے چچا ہیں۔ اُن کی صحت اچھی نہیں ہے۔ اگر آپ اُن سے ملے بھی تو کوئی بات نہ کرسکیں گے، اُن کا دماغ صحیح نہیں ہے۔ ایک عرصہ ہوا کہ اُنھیں صدمۂ عظیم برداشت کرنا پڑا۔ اُن کا سارا کنبہ تباہ ہوگیا اُسی وقت سے اُن کی حالت غیر ہے۔ کاروبار سب بند ہوچکے ہیں صرف یہ دوکان ہے جس کو میں چلا رہا ہوں۔ آخر وہ میرے اصرار پر مجھے مکان پر لے گیا۔ میرے دریافت کرنے پر اُس نے اپنا نام عبدالستار بتلایا۔ مکان تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔ ہم جلد وہاں پہنچ گئے۔ مکان نہایت شاندار، بڑا وسیع اور دو منزلہ تھا۔

مکان کے صدر دروازہ سے گزر کر جب ہم صحن میں داخل ہوئے، تو میں نے دیکھا کہ سامنے بڑے کمرے میں ایک پلنگ پر ایک نحیف و کمزور آدمی لیٹے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور بڑے غور سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے اُنھیں سلام کیا مگر اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اور عبدالستار اُن کے قریب ہی

کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ تھوڑی خاموشی کے بعد میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ میں آپ کے پاس ایک خوش خبری لے کر حاضر ہوا ہوں ۔ یہ سُنتے ہی وہ بڑے برہم ہو کر بولے ۔ "جا...... جا...... جا...... چور...... ڈاکو کہیں کا! میرا گھر لوٹ لیا ـــ بیٹا مار دیا...... بیٹی مار دی...... میری بہو اور عورت کو مار دیا۔ اب مجھے ستانے کے لئے خوشخبری سُنانے یہاں آیا ہے ۔ چل دور ہو سامنے سے ۔" میں نے کہا "جناب قبلہ! آپ کی بیوی اور آپ کے پوتے عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر یہاں حاضر ہوا ہوں ۔ وہ دونوں زندہ اور بخیریت ہیں ۔ اس پر اُنھوں نے بدستور پھر غصہ میں کہا ۔ "تو بھی ڈاکو ، تیرا عبدالرحمٰن بھی ڈاکو اور بدمعاش ۔ چل دور ہو جا یہاں سے ...... آیا ہے مجھے قصہ سُنانے ۔" پھر کچھ اور بڑبڑانے کے بعد وہ زار و قطار رونے لگے اور کہنے لگے آہ! غطومان! تو ہی سب کو چھوڑ کر میرے پاس چلی آتی تو میرا غم غلط ہو جاتا اور مجھے کسی اور کی پروا نہ ہوتی ۔ تو بھی مر گئی ـــ سب مر گئے ۔ ہائے اللہ! میں کیا کروں ۔ اور پھر رونے لگے ، حتیٰ کہ ہچکیاں بندھ گئیں ۔ دیر تک اُن کی یہی حالت رہی ۔ اُن کا یہ حال دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ اب ان سے کسی قسم کی گفتگو کرنا تحصیل لاحاصل ہے ۔ یہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں اور اس صدمہ سے ان کا دماغ خراب ہو چکا ہے ۔ ہر اجنبی شخص ان کے نزدیک ڈاکو ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ اپنی بیوی اور پوتے کو دیکھ کر یہ کچھ اچھی حالت میں ہو جائیں ۔

اُن کو اسی طرح بکتے جھکتے چھوڑ کر میں ستّار کو ساتھ لئے ہوئے ہوٹل واپس آیا۔

ستّار کو کمرے کے اندر بھیج کر میں باہر برآمدہ ہی میں آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ستّار اپنی چچی کو زندہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ دیر تک یہ لوگ آپس میں ملکر روتے اور اپنی سرگذشت سناتے رہے۔ مغرب کے بعد جب قدرے اندھیرا ہو گیا تو میں نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ لوگ اب مکان چلے جائیے اور قابلِ رحم شیخ صاحب سے جاکر ملئے۔ میں کل صبح ۹ یا ۱۰ بجے آپ سے ملوں گا۔ میں جانتا تھا کہ آج کی رات ان کے رونے دھونے ہی میں گذرے گی۔ ایسی حالت میں میرا وہاں جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میرے مشورہ پر وہ رضامند ہو گئے اور مکان روانہ ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ رات اُن پر کیسی گذری۔ مگر اُن کی حالت کا احساس کرتے ہوئے میری طبیعت پر بہت اثر تھا۔ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بستر پر جاکر لیٹ گیا اور دیر تک اپنے خیالات میں غرق رہ کر سو گیا۔ صبح کو ذرا دیر میں اٹھا۔ طبیعت میں کچھ گرانی معلوم ہوتی تھی۔ غسل کیا۔ ناشتہ اور کافی منگوائی۔ پھر باہر آرام کرسی پر بیٹھ کر سگار پینے لگا۔ ابھی دو ہی چار کش کھینچے ہوں گے کہ عبدالستار نے آکر کہا کہ چلئے ناشتہ تیار ہے۔ چچی اماں آپ کو بلا رہی ہیں اور منتظر بیٹھی ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ناشتہ سے تو فارغ ہو چکا۔ تم چلو میں انشاء اللہ ۱۰ یا ۱۱ بجے

تک کھانے سے قبل مکان پر پہنچ جاؤں گا۔ ابھی مجھے کسی قدر آرام کی ضرورت ہے۔
ستار واپس چلا گیا۔ میں دیر تک بیٹھا رہا۔ دس بجے کے قریب اٹھ کر کپڑے پہنے اور تیار ہو کر بازار رہتا ہوا دکان پر پہنچا۔ ستار نے کہا۔ آپ مکان پر تشریف لیجائیے وہاں آپ کا انتظار ہے۔ میں مکان پر پہنچکر عبو کو آواز دی، ملازم آکر مجھے اندر لے گیا۔ شیخ صاحب کے کمرے میں جب پہنچا تو دیکھا کہ آج وہ بہت خوش ہیں اور میرے سلام کا جواب بھی انھوں نے دیا۔ پھر فرمایا کہ شریف! یہاں میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔ تمھارا مزاج کیسا ہے؟ میں نے کہا۔ الحمدللہ اچھا ہوں۔ اپنے مزاج کی کیفیت فرمائیے۔ اس کے جواب میں انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کچھ کہا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو کچھ خدا کی مرضی تھی وہ ہوا، اس کا شکر ہے۔ لیکن آج میں بہت اچھا ہوں اور تم بہت بھلے آدمی ہو۔

اتنے میں بڑی بی نے مجھے دعائیں دیتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔ میں نے تعظیم کے بعد سلام کیا اور دریافت کیا کہ عبو کہاں ہیں۔ کیا وہ کہیں گھومنے چلے گئے؟ دوکان پر تو وہ تھے نہیں، اس لئے کہ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ بڑی بی نے میرے سر پر اپنے دونوں ہاتھ شفقت سے پھیرتے ہوئے کہا کہ شریف! اوپر کمرے میں چلو۔ عبو بھی تھوڑی دیر میں وہاں آجائے گا۔
بڑی بی اس وقت نہایت عمدہ عربی لباس میں تھیں۔ وہ مجھے اوپر کمرے

میں لے گئیں ۔ یہ کمرہ نہایت وسیع ، عمدہ پُرتکلف سامان اور نفیس فرنیچر سے آراستہ تھا ۔ دیواروں پر قدآدم آئینے اور خوش نما کتبے آویزاں تھے ۔ یہیں ایک جانب ایک لوہے کے کمانی دار پلنگ پر گدّے بچھا کر بستر لگا دیا گیا ۔ بڑی بی نے کہا ۔ شریف ! یہ کمرہ آج تمھارے ہی لئے صاف کرکے درست کرا دیا گیا ہے ۔ تم یہیں آرام کرو ۔ ستّار ۱۲ بجے ہوٹل جاکر تمھارا سامان لے آئے گا ۔ یہ کہکر وہ چلی گئیں ۔ میں دیر تک کمرے کے کتبے دیکھتا رہا ۔ کمرے سے ملحق غسل خانہ بھی نہایت خوب تھا ۔ ادھر اُدھر ٹہلنے کے بعد میں کمرے میں ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا اور خیال کرنے لگا کہ آج خلافِ امید جبکہ عبّو کو میرے اس وقت یہاں آنے کا علم ہوگا وہ کہاں چلا گیا ۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ایک گھنٹہ کے قریب ہوگیا ، مگر اب تک اُس کا کہیں پتہ نہیں ہے ۔ کیا گھر پہنچتے ہی اُس نے میری محبت بالائے طاق رکھ دی کہ یکایک سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ معلوم ہوئی اور میں نے دیکھا کہ اس مرتبہ بڑی بی تنہا نہیں ہیں بلکہ ایک نوجوان خاتون بھی عربی سیاہ لباس میں ملبوس دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھے ہوئے یا یوں کہیئے کہ مُنھ چھپائے ہوئے اُن کے ہمراہ ہے ۔ دونوں کمرے میں آگئیں اور آتے ہی بڑی بی نے مجھ سے کہا کہ لو شریف ! یہ تمھارا عبّو ہے ، مگر اب یہ عبّو نہیں بلکہ فطو مان ہے ۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔ حیرت سے انھیں دیکھتا رہا ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں سمجھا

بھی تو یہ سمجھا کہ عبو نے اپنے گھر پہنچنے کی خوشی میں میرے ساتھ مذاق کیا ہے اور مذاقیہ طور پر زنانہ لباس پہنے ہوئے میرے سامنے آیا ہے۔ میں کرسی سے اٹھا، اور عبو کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹا دیئے۔ اب میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی میں نے ہنسکر کہا عبو! واللہ تمہارا حسن تو اس زنانہ لباس میں اور بھی نکھر گیا اور تم نے کمال کیا کہ مجھے مغالطہ میں ڈالنے کے لئے زیور بھی پہن لئے۔ اے کاش! تم سچ مچ عورت ہوتے تو میں ضرور تمہارے ساتھ شادی کرتا۔ بڑی بی میری باتیں سنکر مسکرا دیں اور عبو شرم کے مارے اپنے ہاتھ چھڑا کر نیچے بھاگ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں کرسی پر بیٹھ کر دریائے حیرت میں غرق ہو گیا کہ یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے اور میری آنکھوں نے یہ کیا نظارہ کیا ہے بڑی بی نے مجھے متحیر دیکھ کر تسلی آمیز لہجہ میں کہا کہ شریف! سنو۔ ابھی تمہیں اپنے عبو کو دیکھ کر جو کچھ حیرانی نہ ہوئی ہو، کم ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عبو لڑکا نہیں بلکہ لڑکی ہے، اور اس کا اصلی نام فطومان (فاطمہ) ہے۔ بچپن ہی سے اس کے والد اس کو لڑکوں کا لباس پہناتے رہے۔ چنانچہ جس وقت ہم لوگ گرفتار ہوئے ہیں اس وقت بھی وہ لڑکوں ہی کے لباس میں تھی اور جنگلیوں کے یہاں بھی وہ مردانہ ہی لباس پہنتی رہی۔

بڑی بی سے یہ سنکر میرے دل میں اس کی وقعت نے اور بھی جگہ کر لیا کہ اللہ اللہ! لڑکی ہو کر اس میں یہ بہادری اور دلیری اور اس درجہ انسانی!

اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ جنگل کا وہ میرا رفیق، میرا محسن حقیقت میں مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ میں خاموش جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ بڑی بی بھی نیچے چلی گئیں۔ میں لیٹا ہوا بدستور حیرت میں ڈوبا ہوا تھا اور جنگل کے تمام گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے میری نظر میں پھر رہے تھے اور خیال کر رہا تھا کہ یہ ایک طلسم تھا جو آج یہاں آکر درہم برہم ہو گیا۔ میرا دماغ رہ رہ کر چکر کھاتا تھا کہ کیا وہ عبو نوجوان و بہادر مرد نہیں عورت تھی جو مردانہ بھیس میں دنوں میرے ساتھ جنگلوں میں اور خلوت و جلوت میں کمال بے تکلف رہی؟ پھر میرا دل خود ہی جواب دیتا تھا کہ ہاں! ہاں!! وہ بے شک عورت تھی اور یہی سبب تھا کہ جنگلی مردانہ لباس میں بھی اس کی صورت میں بے پناہ جاذبیت اور کشش تھی۔ اس کی سحر آگیں آنکھوں میں بلا کا جادو تھا۔ اس کی آواز میں درد و دلکشی تھی۔ میں اپنے انھیں خیالات میں غوطے کھا رہا تھا کہ ستار ہوٹل سے میرا سامان لے کر آگیا۔ میرا سامان ہی کیا تھا؟ صرف رائفل، پستول اور پیٹی، جو اس نے لا کر کمرے میں رکھ دیا۔ ۱۲ بجے کے بعد ملازم نے دستر خوان پر کھانا لا کر لگا دیا۔ لیکن یہاں کھانے کی خواہش کس کو تھی۔ مگر بڑی بی کے اصرار پر کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑا۔

شیخ ابوبکر صاحب کے خاندان کا یہ حادثہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، کہ جو ہر کس و ناکس کے دل پر اثر نہ کرتا اور لوگوں کو اس حادثۂ عظیم میں

اُن کے ساتھ دلی ہمدردی نہ ہوتی خصوصاً اُن کی موجودہ قابلِ رحم حالت نے تو شیخ صاحب کے حلقۂ اثر کے علاوہ عوام کو بھی ایک عرصہ سے اپنی جانب متوجہ کر رکھا تھا۔

شیخ ابوبکر صاحب کے مکان میں آج مہمانوں کا ہجوم تھا۔ اطراف و جوانب سے لوگ مبارکباد دینے چلے آرہے تھے، اس لئے کہ یہ خبر ہر جگہ بجلی کی طرح پھیل گئی تھی کہ شیخ صاحب کی اہلیہ اور پوتی زندہ اور سلامت واپس آگئی ہیں۔ شام تک فاطمہ میرے سامنے نہیں آئی، میری طبیعت پر کسی قدر گرانی محسوس ہو رہی تھی اور بھوک کی خواہش بھی مطلق نہ تھی۔ اس لئے میں نے شب کو کھانا نہیں کھایا۔ جس کی اطلاع ملنے پر فاطمہ نے اسکو بہت محسوس کیا اور دوسرے دن صبح ۸ بجے میں نے دیکھا کہ وہ خود ناشتہ لئے چلی آرہی ہے۔ ہم دونوں نے دسترخوان پر ناشتہ کیا۔ اُس کی نظریں نیچی تھیں، مگر وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اسی طرح دو چار بار آنے جانے سے اُس کی جھجک جاتی رہی، البتہ اب وہ پہلے کی طرح بے تکلف نہ تھی کیونکہ اب وہ عبو نہ تھی۔ دن میں وہ اکثر دو ایک مرتبہ صرف کھانے کے وقت آجایا کرتی۔

اب گھر کی حالت بھی درست ہونے لگی اور اچھی خاصی چہل پہل ہوگئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کے پاس پچاس ساٹھ ہزار ڈالر نقد بنک میں جمع ہیں، اس کے علاوہ متعدد مکانات اور دکانیں ہیں جن کے کرایہ

کی خاصی آمدنی ہے۔ ان سب کی مالک اب صرف فاطمہ ہے۔ کھانے کے وقت فاطمہ اور اس کی دادی ضرور میرے ساتھ ہوتیں۔ کبھی کھانا اوپر آتا اور کبھی مجھے نیچے بلا لیا جاتا۔ بڑی بی خود بھی اپنے ہاتھ سے عمدہ عمدہ کھانے پکا کر دسترخوان پر لے آتیں۔

دس بارہ دنوں کے بعد میں نے بڑی بی سے اپنے واپسی کی اجازت طلب کی مگر وہ ٹالتی رہیں، حتیٰ کہ مجھے وہاں بیس روز سے زائد گزر گئے اب میں نے ذرا سختی سے تقاضا شروع کیا تو بڑی بی نے اشاروں کنایوں میں کہا کہ تم امریکہ کیوں جاتے ہو؟ تمھارے لئے یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ سب کچھ موجود ہے۔ روپیہ ہے۔ جائداد ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ سب تمھارا ہے۔ روپیہ لگا کر تجارت کرو، یا ٹھیکے کا کام کرو اور ہمیشہ ہمارے پاس رہو.....

یہ گویا بڑی بی کی زبان سے فاطمہ سے شادی کرنے کا پیغام تھا۔ میں نے اس کے جواب میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بڑی بی اور فاطمہ کو سمجھایا کہ میں زندگی میں اپنا وطن اور ملک چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں اور نہ اپنے عزیز و اقارب، والدین اور بیوی بچوں کو چھوڑ سکتا ہوں اسی طرح میں اپنے اس ارادہ سے بھی باز نہ آؤں گا جس کے لئے گھر سے تہیہ کر کے چلا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے اس وقت اجازت دیدیجئے بہت ممکن ہے کہ امریکہ

سے واپسی پر چند دنوں کے لئے آجاؤں۔

آخر میرے بیحد اصرار پر مجھے اجازت دیدی گئی، لیکن ایک ہفتہ اور قیام کرنے کے لئے کہا گیا جس کو میں نے خوشی سے منظور کرلیا۔ سٹیمر کے آنے میں بھی ابھی ایک ہفتہ کا وقفہ تھا۔

ایک روز بڑی بی نے جب میری برجس دھوبی کو دی تو اس کے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے پتھر نکال کر میرے پاس اوپر بھیجے۔ یہ پتھر وہ تھے جو ایک روز میں نے جزیرے میں دیکھے تھے اور ان میں سے چند اٹھا کر برجس کے جیب میں ڈال لئے تھے۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک روز میں جزیرہ میں گھوم رہا تھا کہ مجھے دھوپ میں چند چمکتے ہوئے پتھر نظر پڑے جن میں سنہری رنگ کے ذرّے چمک رہے تھے میں نے کلھاڑی سے اس مقام پر کھودا تو اسی قسم کے اور بڑے بڑے پتھر نکل آئے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان پتھروں میں سونے کے ذرّے ہیں اور عجب نہیں کہ یہاں سونے کی کان ہو۔ میں نے اسی وقت ان پتھروں کو جیب میں ڈال لیا تھا اور اپنی پریشانیوں کے باعث اس کا ذکر نہ کرسکا تھا اور اس کو چنداں اہم بھی نہ سمجھتا تھا۔

وقت گذاری کے خیال سے میں ان پتھروں کو لئے ہوئے ایک چینی سُنار کی دُکان پر گیا۔ اس نے انھیں بغور دیکھا، پھر ایک گھنٹہ محنت کرنے کے

ان پتھروں میں سے سونا الگ کرلیا اور پھر تیزاب میں ڈالکر صاف کرنے کے بعد ایک گولی کی صورت میں میرے حوالے کردیا۔ نہایت عمدہ خالص سونا تھا۔ میں نے اسے فروخت کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو اس نے مجھے ۶۲ ڈالر دیئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جس جزیرہ میں میں مقید تھا وہاں دولت کا خزانہ بھی موجود تھا، لیکن ان جنگلیوں کے لئے وہ سب بیکار چیز ہے۔ البتہ ڈچ گورنمنٹ کو اگر کبھی اس کا علم ہوگیا تو وہ ضرور وہاں سے سب سونا برآمد کرلے گی۔

فاطمہ حد سے زیادہ میری خاطر و تواضع میں مصروف تھی اور بار بار یہی استدعا کرتی رہتی تھی کہ میں اس کو چھوڑ کر نہ جاؤں۔ اور وہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوکر اس کے دادا کے کاروبار کو ہاتھ میں لے لوں یا اگر اس کے سرمایہ سے کوئی اور کام اپنی پسند کے مطابق کروں جیسا کہ اس کی دادی نے بھی مجھ سے کہا تھا۔ اگرچہ اس کی خاطر شکنی کا خیال مجھے بعید تھا لیکن پھر بھی میری مجبوریاں مجھے ہرگز اس کی اجازت نہیں دے رہی تھیں اور یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ آخر ایک ہفتہ باتیں کرتے گذر گیا اور میری روانگی کا دن آپہنچا۔ اگلی صبح کو مسیسیری جانے والا سٹیمر ۱۰ بجے آنے والا تھا۔

صبح ہوئی۔ ناشتہ کے بعد میں جہاز پر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ میرے ساتھ سوائے کپڑوں اور پستول کے کوئی سامان نہ تھا۔ مگر میں نے دیکھا

کہ ایک عمدہ بستر بڑے سے گدّے کے ساتھ بندھا ہوا رکھا ہے، جس میں کمبل وتکیئے وغیرہ سب کچھ نظر آرہے ہیں۔ ایک نیا ٹرنک اور کھانے کے سامان کی ٹوکری بھی ہے۔ دادی اور پوتی نے خود ملکر اپنے ہاتھ سے اس بستر کو میرے لئے تیار کیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے پاس بستر نہیں ہے۔ ٹرنک میں کئی سوٹ کے کپڑے بلا سیئے ہوئے، رومال۔ موزے اور سلیپر وغیرہ تھے۔ میرا دُھلا ہوا جبہ، سوٹ، پستول اور پیٹی وغیرہ بھی سب اسی ٹرنک میں باحتیاط رکھے ہوئے تھے۔ بستر کی تو مجھے ضرورت تھی ہی لیکن یہ سب سامان بھی میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

میں شیخ صاحب سے رخصت ہوا۔ دادی اور پوتی زار قطار رو رہی تھیں خصوصاً فاطمہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی، لیکن میرا روک لینا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ کرتی تو کیا کرتی؟ آخر

مجھ کو رخصت کیا ہاتھوں سے جگر تھام لیا
سر کو دیوار سے مارا کبھی در تھام لیا

اس میں شک نہیں کہ میں فطرتاً قوی دل واقع ہوا ہوں تاہم اس دردناک نظارہ کا میرے دل پر کافی اثر ہوا مگر میں مجبور تھا اور بیحد مجبور۔ ناچار مجھے انھیں اُسی حالت میں روتا ہوا چھوڑ کر خدا حافظ کہنا پڑا۔

ستار اور ملازمین مجھے جہاز تک سوار کرانے کے لئے آئے اور ایک گھنٹہ

کے بعد سٹیمر بنٹالو سے روانہ ہوگیا۔ دوسرے روز ہم صبح ہی میسیری پہنچ گئے اور امریکن ہوٹل میں جاکر قیام کیا۔ پھر شام کو برونی جانے والی کشتی کا انتظام کرلیا۔ دوسرے دن صبح اٹھکر میں نے غسل کیا۔ ناشتہ سے فارغ ہوا اور دُھلا ہوا برجس سوٹ بدلا لیکن جب میں نے برجس کے جیب میں ہاتھ ڈالا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، اُس میں پانچ سو ڈالر کے پانچ نوٹ موجود تھے آنھیں دیکھتے ہی فاطمہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہ نوٹ فاطمہ کے عطیہ تھے

باب پندرھواں

کیلی جنگلیوں کا قتل عام

جہاز کے برونی روانہ ہو چکنے کے بعد میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا، اور مختلف خیالات آ آ کر مجھے پریشان کئے ہوئے تھے۔ عنایت کے متعلق بڑی فکر لاحق تھی کہ اُس کو مجھ سے جدا ہوئے کم و بیش تین مہینے گزر چکے ہیں، خدا معلوم وہ زندہ ہے یا کیلی جنگلیوں کے ہاتھ مارا گیا، اور اگر وہ زندہ ہے تو کہاں اور کس حال میں ہے۔

سلطان برونی کی جانب سے بھی مجھے اطمینان نہ تھا بلکہ اندیشہ تھا کہ میری وجہ سے شکار میں اُن کا کافی نقصان ہوا ہے، دیکھیے وہ میرے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں اور کیا سلوک کرتے ہیں۔ الغرض انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں دوسرے دن صبح میں برونی پہنچ گیا۔ قلعہ میں جا کر سلطان کی خدمت میں اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ اُنھوں نے فوراً اُسی وقت مجھے طلب فرمایا۔ میرے دل میں اُن کی طرف سے طرح طرح کے خطرات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی میں اُن کے حضور میں

حاضر ہوا، وہ مجھے زندہ اور سلامت دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ اپنے قریب بلا کر مجھے بٹھالیا اور بار بار میری خیریت دریافت فرماتے رہے۔ اور فرمایا کہ ہم تو آپ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور یقین ہو گیا تھا کہ کیلیوں نے آپ کو اپنی بستی میں لے جا کر قتل کر دیا، مگر الحمد للہ کہ آپ کو زندہ پایا۔ میں نے مختصر طور پر اپنی ساری سرگذشت اُن کے حضور میں عرض کر دی اور کہا کہ میں اس وقت بنٹالو سے آرہا ہوں۔

سلطان سے معلوم ہوا کہ کیلیوں کی فوج کے حملے میں ہمارے کیمپ کے آٹھ آدمی زخمی اور چار آدمی جان سے مارے گئے تھے۔ باقی لوگوں نے جنگل میں پناہ لے کر اپنی جانیں بچائیں۔ انھیں زخمیوں میں احمد اور عنایت بھی تھے۔ کیلی لوگوں کے چلے جانے کے بعد ہمارے آدمی چار دن تک وہیں کیمپ میں مقیم رہے اور جو لوگ مر چکے تھے انھیں کفنا دفنا دیا گیا۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی لیکن یہ زخمی سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ کائن قوم کے لوگوں کی بستی وہاں سے قریب تھی اُن لوگوں نے آکر ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ ہمارا گانوں یہاں سے صرف تین کوس کے فاصلہ پر ہے وہاں چلے چلو یہاں سے آرام ملے گا۔ چنانچہ کیمپ والے زخمیوں کو لیکر وہاں منتقل ہو گئے۔ گانوں والوں نے اُن کے رہنے کیلئے اپنے مکانات خالی کر دیئے جس سے زخمیوں کو آرام ملا اور اُن کے

زخم اچھے ہونے لگے ۔ تقریباً ایک ماہ بعد جب یہ کسی قدر سفر کرنے کے قابل ہوگئے تھے اور یہ وہاں سے روانہ ہونے والے ہی تھے کہ اچانک ایک دن سرِ شام انھیں کیلی جنگلیوں نے کائن لوگوں کے اس گاؤں پر دھاوا بول دیا۔ گاؤں والوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی لیکن بالآخر گاؤں والے شکست کھا کر بھاگ گئے۔ کیلی لوگوں نے گاؤں میں داخل ہو کر گھروں کو لوٹا اور پھر کچھ مرد و عورت اور احمد و عنایت کے علاوہ ہمارے دو اور آدمیوں کو قید کر کے اپنے ہمراہ اپنی بستی میں لے گئے۔ ایک ماہ کے قریب ہوا کہ سولہ آدمی مع چند گھوڑوں اور کچھ سامان کے یہاں واپس آئے ہیں۔

سلطان کی زبانی یہ حالات معلوم ہو کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور حواس باختہ ہو گیا، اس لئے کہ میں عنایت کو ان جنگلیوں کی قید میں چھوڑ کر امریکہ نہیں جا سکتا تھا درانحالیکہ مجھے اس کا علم ہو گیا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں اور کس طرح احمد اور عنایت کو ان جنگلیوں کی قید سے رہائی دلاؤں، کیونکہ ان کی رہائی میرے بس کی بات نہ تھی۔ دوسری طرف مجھے جلد امریکہ پہنچنے کی بھی دھن لگی ہوئی تھی۔ غرض تین دن تک میں انھیں پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ تیسرے روز جب میں دوبارہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ارشاد

فرمایا کہ ہم نے اپنے مشیر (ریزیڈنٹ) کی وساطت سے ریاست سارا واک اور ڈچ گورنمنٹ کو اس بارے میں لکھا تھا اور ان سے امداد کی درخواست کی تھی مگر دونوں جگہوں سے یہ جواب آیا ہے کہ راستوں کے طولانی اور دشوار گذار ہونے کی وجہ سے ہماری فوجوں کو وہاں تک پہنچنے میں سخت دقتوں کا سامنا ہوگا۔ لیکن یہ مقامات بروئی سے کچھ دور نہیں ہیں اور سلطانی فوجیں ان لوگوں کی بخوبی گوشمالی کر سکتی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہم نے چاہا تھا کہ کچھ فوج اسی غرض سے وہاں بھیجدی جائے لیکن ہمارے ریزیڈنٹ نے اس سے موافقت نہیں کی۔ سلطان کے اس بیان پر مجھے معلوم ہوا کہ ریاست بروئی آزاد نہیں بلکہ مملکت برطانیہ کے زیر نگیں ہے اور سلطان کو کلی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔

میرے دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی اور مجھے کسی پہلو قرار نہ تھا میں بے چین ہو کر تڑپ اٹھتا تھا اور بار بار دل یہی چاہتا تھا کہ میں تن تنہا جنگلیوں کی بستی میں کود پڑوں اور ان سے لڑ کر جان دیدوں۔ میں یہ جانتا تھا کہ کیلی سردار مجھے دیکھتے ہی غضبناک ہو کر نعل در آتش ہو جائے گا اور مجھے زندہ نہ چھوڑے گا ـــــ میرے دل میں بھی اس کی جانب سے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور طبیعت یہی چاہتی تھی کہ اگر میں کسی طرح ان وحشیوں پر قابو پا جاؤں تو ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں اور سب کو تہس نہس

کردوں۔ میں نے سلطان سے عرض کیا کہ میں نہایت شرمندہ ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے بہت زحمت اُٹھانی پڑی۔ لیکن جب سے مجھے اس امر کا علم ہوا ہے کہ ہمارے چار آدمی ہنوز اُن جنگلیوں کی قید میں ہیں، انتہائی قلق اور صدمہ ہے، جس کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر حضرت اقدس میری کچھ فوج سے امداد فرمائیں تو میں اپنے آدمیوں کو اُن کی قید سے رہائی دلانے نیز معقول طور پر اُنکی گوشمالی دینے کی کوشش کروں، تاکہ آئندہ کے لئے اُنھیں عبرت ہو جائے۔

سلطان نے وعدہ فرمایا کہ اچھا وہ اس بارے میں دوبارہ سعی فرمائینگے۔

اسی ردّ و قدح میں مجھے یہاں ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں نے جو کچھ زرِ نقد میرے پاس تھا اُن میں سے تھوڑا سا خرچ کے لئے نکال کر باقی سٹرلنگ بنک کے نام اپنے حساب میں بھیجدیا۔ اپنا ٹرنک جس کو میں نے داروغہ کے پاس امانتاً رکھ دیا تھا، واپس لیا۔ اُس میں جو مالِ تجارت بچا ہوا تھا اُس میں سے چند عمدہ زیور اور انگوٹھیاں وغیرہ انتخاب کر کے ایک پارسل کی صورت میں بنّا لو فاطمہ کے پاس بھیجدیئے اور ایک خط کے ذریعہ سے اپنے حالاتِ حاضرہ سے اطلاع دی اور گھر بھی خطوط لکھے۔

اس اثنا میں میں خود بھی براہِ راست رزیڈنٹ سے ملا۔ وہ سلطان کے حکم کے بموجب میرے ساتھ فوج بھیجنے کی منظوری دے چکے تھے۔

مگر بہت مختصر۔ یعنی صرف بیس۲۰ سپاہی اور دو۲ عہدہ داروں کی منظوری تھی۔ باورچی اور دیگر عملہ اس کے علاوہ تھا۔ یہ فوجی سپاہی رائفلوں اور دیگر اسلحوں سے مسلح تھے۔ میری درخواست پر ایک اوٹومیٹک مشین گن جس میں ایک مرتبہ میں بہت سی گولیاں چلتی ہیں اور گھومتی بھی ہے۔ ہمارے ساتھ کردی جانے کے لئے حکم دیدیا گیا۔ دونوں جمعدار اس کو چلانا جانتے تھے۔ میں نے خود بھی دو روز اس کے چلانے کی مشق کی اور اسکو چلانا سیکھ گیا۔ ایک گھوڑے پر یہ مشین بار کی گئی۔ چند گھوڑوں پر سامان رسد وغیرہ تھا اور ہم سب پاپیادہ تھے۔

روانگی کے وقت سلطان نے اپنے حکم سے اس مختصر فوج کو میری قیادت میں کیا اور اُن سب کو میرے حکم کی تعمیل کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی۔ گھوڑوں پر سب سامان تیار تھا۔ ہم خدا کا نام لے کر روانہ ہوگئے میں خوش ہو رہا تھا کہ اب مجھے ان جنگلیوں سے انتقام لینے کا کافی موقع ملے گا۔ البتہ کبھی کبھی اپنی قلت تعداد اور اُن کی اکثریت کا خیال دل میں پیدا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کیلی جنگلیوں کی تعداد جو ہمارے مدمقابل بن سکیں گے کسی طرح سات آٹھ سو سے کم نہیں ہے اور ہم صرف تیئیس۲۳ آدمی ہیں جو اُن کے مقابلہ میں بزدآزمائی کے لئے جارہے ہیں اور ہم کو بہ لحاظِ تعداد اُن سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہو سکتی۔

صرف ایک جوشِ انتقام تھا جو مجھے کھینچے لئے جا رہا تھا۔

میں نے اپنے دل میں لڑائی کے میدان کا نقشہ کھینچنا شروع کیا۔ اُن کی بستی کا موقع اور بستی کے سامنے کا میدان۔ اِرد گرد کی پہاڑیاں جنھیں میں دیکھ چکا تھا اُنھیں کے بموجب لڑائی کے مواقع تلاش کرتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اُن کی بستی کے سامنے جو میدان ہے اور اُس میدان کے سر پر جو پہاڑیاں ہیں اگر ہمیں اُن پر کوئی مناسب جگہ مِل جائے گی، اور ہم اُن جنگلیوں کو کسی طرح اپنے سامنے اُس میدان میں لا سکیں گے تو ہم یقینی کامیاب ہوں گے اور مشین گن سے اُن کی پوری طرح مزاج پُرسی کر سکیں گے۔ لیکن اُن کو گھروں سے نکال کر میدان میں جمع کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اپنی کمی تعداد کے باعث سب سے بڑا اندیشہ یہی ہو رہا تھا کہ اگر وہ میدان میں نہ آئے، یا مرتے کٹتے کسی طرح ہم تک پہنچ گئے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ ہم دست بدست لڑائی میں جیسا کچھ اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔

میں انھیں خیالات میں اُلجھا ہوا تھا اور ہم سب گھاٹیوں، پُرخطر وادیوں اور مرغزاروں کو طے کرتے ہوئے منزل بہ منزل آگے بڑھے چلے جا رہے تھے حتیٰ کہ ایک ہفتہ کی مسافت طے کرنے کے بعد کوہ مولو کے گھنے جنگلوں میں پہنچ گئے۔ کھانے کے لئے ہم روزانہ شکار کر لیا کرتے تھے اور جب کوئی درندہ نظر آ جاتا تو ہم خود اُس سے بچ جاتے اور چشم پوشی کر لیا

کرتے تھے کیونکہ ہم ایک مہم پر جا رہے تھے اور دیدہ و دانستہ گولیوں کو ضایع کرنا مقصود نہ تھا۔

یہاں پہنچکر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمیں اُن کائنوں لوگوں کی بستی میں چلنا چاہیئے جن سے کیلی جنگلیوں کی اَن بَن رہا کرتی ہے اور ایک دوسرے سے ہمیشہ دست و گریباں رہا کرتے ہیں۔ اور ہمیں اُن کی اس دشمنی سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے گونہ تقویت حاصل ہوئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چنانچہ ہم نے اپنے سفر کا رُخ کائنوں کی بستی کی جانب پھیر دیا اور دوسرے دن ہم وہاں جا پہنچے۔ بستی کے باہر ہمارا کیمپ کر دیا گیا۔ شام کے وقت میں دو آدمیوں کو لیکر کائنوں کے سردار سے ملا۔ انھیں بستی والوں نے ہمارے آدمیوں کو اپنے یہاں ایک مہینہ تک پناہ دی تھی۔ جس کا میں نے سردار کے سامنے شکریہ پیش کیا اور کیلیوں کے ظلم و تشدد کا ذکر کیا۔ سردار خود اُن سے نالاں تھا اُس نے دیر تک اُن کو بُرا بھلا کہا۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر آپ کچھ آدمیوں سے میری امداد کریں تو میں اُن کو اُن کے جور و تعدی کا مزا چکھانے کیلئے تیار ہوں۔ آپ کا ایک آدمی بھی ضایع نہ ہوگا اور اُن کے دانت ایسے کھٹے پڑ جائیں گے کہ پھر مدت العمر آپ سے مقابلہ کرنا تو درکنار آنکھیں تک برابر نہ کر سکیں گے۔ سردار نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں سو آدمی دینے کو

تیار ہوں۔ یہ سنکر مجھے بڑا اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی اور ایک بڑی حد تک کامیابی کی امید ہوگئی۔ وہاں سے آنے کے بعد میں نے دوسرے دن صبح روانگی کا اعلان کردیا۔ یہاں سے کیلی لوگوں کے گانوں کا فاصلہ بارہ کوس سے زیادہ نہ تھا، مگر راستہ اتنا دشوار گذار تھا کہ گھوڑوں کا اُس پر سے گزرنا ناممکن تھا۔ اس لیے گھوڑے اور ملازمین اسی بستی میں چھوڑ دیئے گئے مشین گن کھول کر تین جنگلیوں پر بار کرنے کے بعد صبح ہی ہم نے کوچ کردیا۔ سَو آدمیوں کا لشکر کائنوں کا بھی مع اپنے اسلحوں اور طبل جنگ وغیرہ کے ہمارے جلوس میں تھا۔ اب میں اس مختصر سی رجمنٹ کا کمانڈر تھا اور وہ میرے ایک ادنیٰ اشارے پر کٹ مرنے کے لئے تیار تھے۔

ان دشوار گذار راستوں اور پہاڑوں سے گذرتے ہوئے ہم چار بجے شام کے قریب کیلی بستی سے ایک میل کے فاصلہ پر پہنچ گئے۔ ایک مناسب جگہ رات بسر کرنے کے لئے قریب کی پہاڑی پر تجویز کی اور وہیں ٹھہر گئے۔ دو کائن جنگلیوں کو پہرہ پر مقرر کرنے کے بعد میں نے عنایت کے نام پنسل سے ایک پرچہ لکھا، اس میں اپنے پہنچنے کی اطلاع دی اور لکھا کہ صبح تک جس وقت بھی موقع ملے تم چاروں آدمی فرار ہو کر ہمارے پاس چلے آؤ۔ پھر ایک کائن کو بلا کر یہ پرچہ اس کے سپرد کیا اور اس کو تاکید کردی کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد اس کاغذ کو بستی میں لے کر جاؤ اور سردار کے مکان میں ہمارے

کچھ آدمی ہیں اُنھیں اس کاغذ کو احتیاط کے ساتھ دے کر واپس آجاؤ۔ شام کو ہم نے ناشتہ کیا۔ آفتاب غروب ہونے کے بعد ماہتاب نکل آیا۔ میں دو کو جمعداروں اور دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر میدانِ جنگ کا موقع دیکھنے کے لئے روانہ ہوگیا۔ دو کائن بھی ہمارے ساتھ ہولئے۔ تھوڑی دیر میں ہم پہاڑ کی اُس چوٹی پر پہنچ گئے جس کے سامنے نشیب میں وہ میدان تھا۔ اور تھوڑے فاصلہ پر کیلیوں کی بستی نظر آرہی تھی۔ بستی کے بعد جھیل تھی۔ دو گھنٹے دیکھ بھال میں صرف کرکے ہم نے اپنا پروگرام مناسب موقع پر مرتب کرلیا اور اطمینان کے ساتھ واپس آگئے۔ تمام شب میں نے بے چینی میں گذاری۔ تھوڑی دیر کے لئے آنکھ لگ جاتی۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور پھر لیٹ رہتا۔ جب صبح کے ۴ بجے تو میں نے سب کو جگا کر تیاری کا حکم دیا، اور ہم سب خاموشی کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ جس مقام کا میں معائنہ کرچکا تھا وہاں پہنچکر میں نے اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق موقع پر بٹھا دیا۔ اس پہاڑ سے جو راستہ نشیب میں میدان کو جاتا تھا اور جو ایک درّہ سے ہوکر گزرتا تھا، اُس کے داہنی جانب پہاڑی پر ۱۸ سپاہی اور ایک جمعدار کو بٹھا دیا۔ بعدہٗ میں خود دو سپاہی، ایک جمعدار، تین کائن اور مشین گن ہمراہ لے کر درّہ کی بائیں طرف والی پہاڑی کی چوٹی پر چلا گیا جہاں ایک مناسب موقع پر مشین گن کو فٹ کرلیا۔ اس کام کے

تکملہ کے بعد میں نے سب کائنوں کو درّے کے اندر جمع کیا اور انھیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ سردست تمھارے ذمّے صرف اتنا ہی کام ہے کہ تم کیلیوں کو کسی ترکیب سے اُن کے گھروں سے نکال کر اس میدان میں جمع کر دو۔ جب وہ میدان میں جمع ہو کر تمھارا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو تم سب بھاگ کر درّے میں آجاؤ۔ ایک آدمی بھی باہر نہ رہے۔ وہ بخوبی سمجھ گئے۔ ہم اسی انتظام میں مصروف اور دوڑ دھوپ کر رہے تھے کہ احمد، عنایت اور باقی ہمارے دو آدمی اور ہمارے پاس پہنچ گئے۔ عنایت کو زندہ دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مجھے بڑی مسرّت ہوئی۔ عنایت آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ ان لوگوں کے آجانے سے مجھے بڑا اطمینان نصیب ہوا۔ احمد نے میری رائفل لی اور ایک طرف جا بیٹھا۔

اب آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا اور تقریباً آٹھ بجے تھے۔ میری مرضی کے مطابق جب سب انتظامات درست ہو گئے تو میں نے درّے کے اندر کائن لوگوں کو ڈھول اور طبل بجانے کا حکم دیدیا۔ باجوں کی آواز سے تمام پہاڑ گونج اُٹھے۔ ہم بڑے اطمینان سے اپنی کمیں گاہ میں چھپے ہوئے بستی کے جنگلیوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ طبل کی آواز نے بستی کے اندر لوگوں میں ایک ہلچل سی ڈال دی۔ ہر شخص اِدھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ کائن سردار نے انتقام لینے کے غرض سے

اپنی فوج کے ساتھ دھاوا بول دیا ہے۔ چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر سیکڑوں کیلی اپنے ہتھیار لئے ہوئے میدان میں آموجود ہوئے اور ان کا تانتا بندھا رہا۔ کچھ لوگ تیر و کمان لئے ہوئے مکانوں کی چھتوں پر جا بیٹھے۔
کیلیوں کے میدان میں آجانے کے بعد ہمارے کائن بھی درّے سے نکلکر باہر میدان میں آگئے اور ایک گھنٹے کے اندر ہی دونوں فوجیں مدمقابل بن گئیں۔ دونوں جانب سے طبل جنگ بج رہے تھے اور جنگ کا پورا نقشہ میدان میں جم چکا تھا۔ کیلی سردار اپنی مخصوص پوشاک میں میدان جنگ میں در آیا اور اسی کو میری متجسّسانہ نگاہیں ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اس کے آتے ہی لڑائی شروع ہوگئی۔ دس منٹ مشکل سے گذرے ہوں گے کہ بموجب ہدایت ہمارے کائن میدان چھوڑ کر اُلٹے پاؤں درّے کی جانب بھاگے اور کیلیوں نے اُن کا تعاقب کیا۔ یہی ہم چاہتے تھے اور اسی وقت کے منتظر ہم بیٹھے تھے۔ مشین گن میرے ہاتھ میں تھی جس کا میگزین بھرا ہوا لیس تھا۔ جیسے ہی کائن درّے میں داخل ہوگئے اور کیلی فوجیں زد میں آگئیں ہم نے فوراً اُن پر رائفلوں اور مشین گن سے گولیاں برسانی شروع کردیں۔ مشین گن تڑ تڑ چل رہی تھی اور گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ کیلی دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ ان کا سردار چونکہ آگے تھا، وہ سب سے پہلے جہنم رسید ہوگیا۔ کیلیوں کی خاک سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ ہم پر یہ کیا قیامت ٹوٹنی شروع ہوگئی۔ آخر کب تک اس بلائے بے درماں

کے سامنے سینہ سپر رہتے ؟ ادھر اُدھر بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ اب بھی ہم نے اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

سیکڑوں کیلیوں کی لاشوں کا آن کی آن میں پُشتہ لگ گیا۔ ان کے بڑے بڑے سورما اور بہادر کام آگئے۔ بہت سی لاشیں پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ باقی ماندہ لوگ اپنی جانیں لئے ہوئے سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ یہ قیامت خیز نظارہ کم و بیش ایک گھنٹہ تک رہا۔ اس میدان میں کیلی سردار اور اُس کی قوم کے سیکڑوں آدمی کام آچکے تھے۔ ہم نے ان کی بستی کی جانب اب نگاہ کی تو دیکھا کہ بستی خالی ہوئی جا رہی ہے اور ان کی فریاد و فغاں اور شور و ہنگامہ سے ایک حشر بپا ہے۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے سب گانوں چھوڑ کر اُس جزیرہ کی طرف بھاگے جا رہے ہیں جس میں ان لوگوں نے مجھے قید کر رکھا تھا اور میری زندگی کا ایک مہینہ سے زیادہ زمانہ وہاں گذرا تھا۔ تمام جنگل ان کے شور سے گونج رہا تھا۔ ہمارے ساتھ جو کائن تھے وہ اس ہلاکت آفریں منظر کو دیکھ کر خوشی سے جامہ میں پھولے نہ سما رہے تھے اور رہ رہ کر فتح کے جوش میں اپنے نعرے لگا رہے تھے۔ ہمارے سب آدمی محفوظ تھے اور ایک بھی زخمی نہ ہوا تھا۔ جب بستی خالی ہو گئی اور پس ماندہ کیلی جزیرہ میں چلے گئے تو میں سب کو لئے ہوئے درّہ کے راستہ سے نیچے اُترا اور بستی میں گیا۔ وہاں ہُو کا عالم تھا۔ تمام مکانات خالی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے کائن لوگوں کو

ان کے لوٹ لینے کی اجازت دیدی۔ پھر کیا تھا، "دیوانہ را ہوئے بس است" سب چشم زدن میں ٹوٹ پڑے اور دھڑی دھڑی کر کے سب لوٹ لایا۔ احمد بھی چار بندوقیں جا کر لے آیا۔ ایک تو اسی کی ذاتی بندوق تھی۔ دو سنگل بیرل امریکن تھیں اور ایک چھوٹی رائفل تھی۔ اس کے بعد ہم واپس ہو کر درّہ کے راستہ سے پہاڑی پر آگئے اور وہاں سے کوچ کر دیا۔ شام سے قبل ہم کائنوں کی بستی میں پہنچ گئے۔ مقامی کائنوں نے کیلی سردار اور اس کے بہت سے ساتھیوں کے مارے جانے کی خبر سنکر بڑی خوشیاں منائیں۔ رات ہم نے بڑے اطمینان سے وہیں بسر کی۔ عنایت اور احمد اپنی اپنی سرگذشتیں سناتے رہے پھر میں سو گیا۔ دوسرے روز صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم نے وہاں سے کوچ کر دیا اور بدستور سالوین انھیں وادیوں اور گھاٹیوں میں مارچ کرتے اور ندی، نالوں سے گزرتے ہوئے ایک ہفتہ کے بعد ہم شہر برونی میں داخل ہو گئے۔ سلطان ہماری کامیابی پر نہایت خوش ہوئے۔ تین دن میں ان کا مہمان رہا، چوتھے روز میں رخصت حاصل کر کے ایک چھوٹے جہاز کے ذریعہ عنایت کو لے کر لابون پہنچا۔ وہاں سے سٹیمر پر سوار ہو کر سنگاپور آگیا۔ گھر اور دوستوں کے بہت سے خطوط آ کر جمع ہو گئے تھے۔ سب کے جوابات لکھے۔ بناتوست آیا ہوا فاطمہ کا خط بھی تھا اسے بھی جواب لکھا اور کیلی سردار اس کی قوم کے حشر کے تفصیلی حالات لکھ دیئے۔

دس ماہ قبل جب میں بورنیو میں داخل ہوا تھا تو میرے امریکہ پہنچنے کی راہ میں سب سے بڑی دو مشکلیں حائل تھیں۔ ایک تو سرمایہ کی کمی اور دوسری حدود امریکہ میں داخلہ کی اجازت۔ اس عرصہ میں خدا کے فضل سے پہلی دقت تو کسی حد تک جاتی رہی تھی کیونکہ اس وقت میرے سوا تین ہزار روپے کے قریب بنک کی تحویل میں جمع تھے جو ہمارے امریکہ پہنچنے اور ڈنٹیل کالج وغیرہ کے ایک سال کے اخراجات کے لئے کافی تھے البتہ وہاں دو سال اور گذارنے کے خرچ کی گونہ فکر تھی جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ میں اس کمی کو اپنے زمانۂ دورانِ تعلیم میں بذریعہ تجارت پوری کروں گا اور اس لئے مجھے اب روپے کی کمی کی چنداں پروا نہ تھی۔ ہاں ساری کوشش اور فکر جو سب سے زیادہ تھی وہ فلپائن میں داخلہ کے لئے تھی۔ فلپائن کے کسی جزیرے میں بھی داخل ہو جانے کے بعد پھر مجھے یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ پہنچنے میں کوئی رکاوٹ مانع نہ ہو سکتی تھی، لیکن فلپائن کے داخلہ کے سوال کا حل آسان نہیں نظر آرہا تھا۔ البتہ تجربہ اس امر کا شاہد تھا کہ جو پابندیاں سنگاپور سے منیلا جانے میں ہیں وہ بورنیو سے منڈناؤ جانے میں نہیں پائی جاتیں۔ فلپائن کا یہ جنوبی جزیرہ (منڈناؤ) سنڈاکن سے بہت قریب ہے۔ اُس کا بڑا شہر اور بندرگاہ "زنبوگا" سٹیمر کے راستہ سے صرف ۲۴ گھنٹے کے سفر کی دوری پر ہے۔

ایک روز میں امریکن قونصل سے جا کر ملا۔ اُن سے اپنا ارادہ فلپائن

جانے کا ظاہر کیا اور اُن سے وہاں کے داخلہ کے لئے پاسپورٹ کی خواہش ظاہر کی۔ اُنھوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ یہاں سے آپ کو پاسپورٹ دیدیا جائے گا لیکن وہاں داخلہ کے وقت آپ کو کچھ مشکلات پیش آئیں گی یعنی وہاں پہنچتے ہی آپ کو کسٹم آفیسر کے روبرو تین شرطیں پوری کرنی ہوں گی۔

۱۔ عمدہ صحت جسمانی۔

۲۔ یورپ کی کسی زبان سے واقفیت۔

۳۔ فی آدمی ایک سو امریکن ڈالر (تین سو روپے) نقد دکھانے ہوں گے۔

میں نے اُنھیں اطمینان دلایا کہ میں بخوشی ان تینوں شرطوں کو پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد اپنے اور عنایت کے لئے پاسپورٹ کی درخواست دیدی۔ امریکن قونصل نے ہم سے معمولی فیس لے کر دو پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیئے۔ اس کے بعد ہم جہاز کمپنی کے دفتر میں گئے، جہاں ہم سے زنبونگا تک دو ٹکٹوں کا ڈبل کرایہ یعنی واپسی کا کرایہ بھی وصول کر لیا گیا اور وہ اس خیال سے کہ اگر ہم کو وہاں اُترنے نہ دیا گیا تو وصول شدہ واپسی کرایہ میں وہ ہم کو پھر سنڈیکین پہنچا دیں گے اور اگر ہم کو داخلہ کی اجازت مل گئی

تو پھر یہ واپسی کا کرایہ ہم کو زنبو نگا میں جہاز کے دفتر سے واپس مل جائے گا۔
سٹیمر کے روانہ ہونے میں ابھی تین اور کا وقفہ تھا۔ ہم نے سفر کے لئے تیاری شروع کر دی۔ بنک سے اپنے کل روپئے نکال کر کچھ روپے خرچ کے لئے رکھ لئے اور تین ہزار روپوں کو امریکن گولڈ سا ورن (پونڈ) کی صورت میں تبدیل کر لیا۔ امریکن پونڈ سونے کے پندرہ روپئے تیس روپے اور ۶۰ روپئے کے ہوتے ہیں۔ میں نے ان سب چھوٹے بڑے پونڈوں کو ایک مخمل کی تھیلی میں رکھ کر اپنے بکس میں رکھ دیا۔ ان کے علاوہ میرے پاس خرچ کے لئے بھی کافی روپے تھے۔ تیسرے روز بعد دوپہر ۲ بجے کے قریب ہم مع سامان کے جہاز پر سوار ہو گئے۔ بہت سے مقامی لوگ ہمیں جہاز تک خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ ۴ بجے شام کے قریب جہاز روانہ ہو گیا۔

میں کم و بیش دس ماہ جزیرہ بورنیو میں رہا۔ اس عرصہ میں یہاں کافی طور پر صدمات و مصعوبات برداشت کیں۔ شکار بھی خوب کھیلا۔ زندگی بھی خطرے میں پڑی مگر خدا نے بال بال بچایا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے شکار اور گھنے جنگلوں میں تکالیف و خطرات کا ساتھ ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایک شکاری کے لئے بلا شبہ وہ شکار پر لطف ہی نہیں جو بلا تکلیف و خطرے کے حاصل ہو، اور ان تکلیفوں میں بھی ایک شکاری کو خاص لطف حاصل ہوتا ہے اور جس سے کچھ وہی لوگ

بخوبی واقف ہیں جنھیں اکثر شیر، ہاتھی اور دیگر خوفناک درندوں کے شکار کھیلنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی اسی لطف میں فنا کر دینا چاہتے ہیں اور یہی لوگ اصلی معنی میں شکاری کہلانے کے مستحق ہیں۔ ورنہ یوں تو شکار کے شوقین ہر جگہ اور بکثرت موجود ہیں، جن کا شکار صرف پرندوں، ہرن، نیل گائے اور چیتے وغیرہ تک محدود ہے۔

بہرحال میرا وقت بورنیو میں نہایت دلچسپی سے گذرا اور خدا کے فضل سے میں اپنی سکیم میں کامیاب رہا۔

اگر میں بورنیو میں دلجمعی سے صرف اپنا کاروبار ہی کرتا رہتا اور مجھے شکار و قدرتی مناظر سے محظوظ ہونے کا چسکا نہ ہوتا تو بلاشبہہ اس عرصہ میں میں ایک بڑی رقم کا مالک ہو گیا ہوتا لیکن میں نے اپنا زیادہ تر وقت شکار اور جنگلوں میں گذار دیا۔

*

باب سولھواں

جزیرہ منڈناؤ (فلپائن)

پُراسرار مکان

دوسرے روز ہمارا جہاز شام کے ۳ بجے کے قریب فلپائن کے پہلے بندرگاہ زمبوگا میں داخل ہو کر کنارے سے فاصلہ پر لنگر انداز ہو گیا۔ مجھے کچھ نہ تشویش سی ہو رہی تھی کہ کہیں ہم کسٹم آفیسر کے سامنے فیل نہ ہو جائیں خصوصاً عنایت کی جانب سے زیادہ خطرہ تھا، اس لئے کہ وہ انگریزی نہیں بول سکتا تھا۔ کہیں یہ راز ظاہر نہ ہو جائے۔ میں اسی فکر اور کشمکش میں تھا ہی کہ سامنے سے ڈاکٹر کی کشتی آتی دکھائی دی اور تھوڑی دیر میں ڈاکٹر ہمارے جہاز پر آ پہنچا۔ تمام مسافر ایک قطار میں کھڑے کئے گئے اور ڈاکٹر نے ایک طرف سے سب کو دیکھنا شروع کیا۔ میری اور عنایت کی صحت خدا کے فضل سے اچھی تھی۔ ہمارے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ میں بھی تعریف درج تھی اس لئے ہمیں ڈاکٹری معائنہ کا چنداں اندیشہ نہ تھا۔ ہم دونوں پاس ہو گئے۔

اس کے بعد جہاز کے مسافروں کو مع سامان کے کسٹم ہاؤس پہنچایا گیا۔ ہم کشتیوں کے ذریعہ سے کسٹم ہاؤس گئے۔ سب مسافروں کا سامان نیچے کی منزل میں روک لیا گیا۔ میں نے اپنے بکس میں سے مخمل کی تھیلی جس میں سونے کے پونڈ بھرے ہوئے تھے نکال لی اور بکسے بستر بھی ساتھ لے لیا اس لئے کہ بقیہ سامان ہمیں دوسرے دن حوالے کرنے کو کہا گیا تھا۔

پاسپورٹ میرے جیب میں موجود تھے۔ کسٹم آفیسر ایک امریکن تھا اور اُس کا دفتر بالائی منزل پر تھا۔ سب مسافروں کو اوپر لے گئے۔ مسافر زیادہ نہ تھے، کُل ۲۵، ۳۰ آدمی ہوں گے۔ ان میں صرف ہم دو آدمی ہندوستانی تھے، بقیہ چینی۔ ملائیز اور جاپانی تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ہم سب کے بعد میں پیش کئے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہمارا نمبر سب کے بعد میں آیا۔ جب میں امریکن آفیسر کے سامنے گیا تو میں نے عنایت کو اپنے ساتھ لے لیا۔ سامنے پہنچتے ہی آفیسر نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا انگریزی بول سکتے ہو؟ میرے اثبات میں جواب دینے پر اُس نے سوالات شروع کر دیئے۔ میں سب کے جوابات بہ اطمینان دیتا رہا۔ سوال بہت معمولی تھے۔ کہاں سے آئے ہو؟ کس غرض سے آئے ہو؟ کہاں کاروبار کرو گے؟ اس ملک میں کتنا عرصہ ٹھہرو گے وغیرہ وغیرہ۔

پاسپورٹ میں نے پہلے ہی دیدیئے تھے۔ جب عنایت کے متعلق اُس نے سوال کیا تو میں نے جواب دیا کہ یہ میرا ملازم ہے۔ باورچی کا کام بھی کرتا ہے اور میرے کاروبار میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس پر اُس نے عنایت سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے بعد نقد روپئے کا سوال پیش ہوا جو آخری تھا۔ میں نے مخمل کی تھیلی جو میرے ہاتھ میں تھی اُس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ قاعدہ کی پابندی کے مطابق ہم دونوں کے پاس دو سو امریکن ڈالر (چھ سو روپئے) ہونے ضروری تھے مگر تھیلی میں ایک ہزار ڈالر کے پونڈ تھے۔ اب آفیسر ہر طرح مطمئن تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو پاس کر دیا اور فلپائن میں ہم کو داخلہ کی اجازت مل گئی۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

اب میرے سامنے امریکہ کا راستہ بالکل صاف تھا۔ وہاں جانے کے لئے اب مجھے کسی پاسپورٹ کی ضرورت باقی نہ رہی تھی صرف جہاز کا ٹکٹ منیلا سے خرید لینا کافی تھا۔

کسٹم آفیسر کے دفتر سے نکل کر جب ہم شاداں و فرحاں باہر آئے تو ایک اور مصیبت میں گرفتار ہو گئے یعنی پولیس آفیسر نے سب مسافروں کو ہسپتال چلنے کے لئے کہا۔ چنانچہ ہم سب ہسپتال گئے۔ وہاں ایک امریکن ڈاکٹر نے

ہر مسافر سے ایک ایک ڈالر وصول کر کے چیچک کا ٹیکہ لگانا شروع کر دیا۔ بیچارے مسافر بھیڑوں کی طرح پکڑے جا رہے تھے اور ٹیکے لگ رہے تھے۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ اس اجنبی ملک میں ابھی ہمارے رہنے کا تو کہیں ٹھکانا ہے نہیں، اگر ٹیکوں کے سبب سے ہم کو تکلیف ہو گئی تو بڑی مصیبت ہو گی۔

ایک زمانہ ہوا جب اسکول کے زمانۂ تعلیم میں میرے ٹیکے لگائے گئے تھے اور ان کے نشانات ہنوز میرے بازو پر نمایاں تھے۔ اتفاق سے عنایت کے بازو پر بھی نشان موجود تھے۔ جب ہماری باری آئی تو میں نے ڈاکٹر کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی اور اس میں بتایا کہ انڈیا میں اس کے خاص طور پر محکمے ہیں اور گورنمنٹ کی جانب سے وہاں بڑی احتیاط کی جاتی ہے اور اپنے بازوؤں کے نشانات اس کو دکھائے۔ میری باتیں ڈاکٹر نے باور کر لیں اور ہمیں چھوڑ دیا۔

اب ہم آزاد تھے۔ جب ہم ہسپتال سے نکلے ہیں تو شام کے ۵ بج چکے تھے۔ عنایت کے بغل میں بستر تھا اور میرے ہاتھ میں تھیلی۔ مجھے اس کی فکر تھی کہ اگر ناوقت نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس کو کسی بنک میں امانتاً جمع کر دیتا۔ ہم سڑک پر شہر کی جانب چلے جا رہے تھے اور ہم کو اس وقت ایک ہوٹل کی تلاش تھی۔ ہماری نظر جس سمت جاتی تھی ہر چیز اجنبی

پاتی تھی۔ نئے لوگ، نئی طرز معاشرت اور نئی زبان۔ کوئی شخص بھی ان میں ہمارا ہم جنس نظر نہ آتا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں ہماری نظریں کسی ہندوستانی کو تلاش کر رہی تھیں، مگر ان کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ متعدد مقامی لوگوں سے ہم نے کسی ہوٹل کا پتہ دریافت کیا، مگر پتہ کیا ملتا خاک! نہ تو وہ ہماری زبان سمجھتے تھے اور نہ ہم اُن کی۔

سارے فلپائن کے جزیروں میں عام طور پر ٹیپا لوگ زبان بولی جاتی ہے۔ امریکہ کے تسلّط کے بعد فلپائن کے سکولوں میں انگلش بول لیتے ہیں مگر عوام اس سے قطعی بے بہرہ ہیں۔ جب ہم ان سڑکوں سے گذرتے ہوئے بڑے بازار میں پہنچے، جہاں سوداگروں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں، وہاں میں نے ایک بڑی دُکان پر پوہومل برادرس کے نام کا بورڈ لگا ہوا دیکھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ ضرور سندھیوں کی دُکان ہے۔ دوکان بہت بڑی تھی اور اُس کے اندر میں نے سندھی لوگوں کو بھی دیکھا۔ ہم دوکان کے اندر چلے گئے۔ میں مینیجر سے ملا، اُن سے معلوم ہوا کہ پوہومل برادرس حیدرآباد سندھ کی ایک بڑی فرم ہے۔ دنیا میں کئی جگہ ان کی دُکانیں ہیں۔ فلپائن میں بھی متعدد مقامات پر اس دوکان کی شاخیں ہیں۔ منیلا میں ہیڈ آفس ہے اور یہ بھی ایک برانچ ہے۔ تھیلی جو میں ہاتھ میں لئے پھر رہا تھا اُس کو میں نے مینیجر صاحب کی امانت میں

رکھ دیا۔ اُن سے کسی ہوٹل کا پتہ دریافت کیا تو اُنھوں نے بتلایا کہ شہر سے تھوڑے فاصلہ پر سمندر کے کنارے ایک ہوٹل ہے جو یہودیوں کا ہے اور ایک چھوٹا سا ہوٹل اور ہے جس کو ایک پنجابی مسلمان نے کھول رکھا ہے خود تو وہ پولیس میں ملازم ہے لیکن ایک دوسرے ہندوستانی ملازم کے ذریعہ سے خاصہ چل رہا ہے وہ ہوٹل بازار میں شہر کے دوسرے حصے میں واقع ہے۔

اب آفتاب غروب ہو چکا تھا ہم ہوٹل کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے زنجونگا کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ تیس چالیس ہزار کی آبادی ہوگی۔ امریکن اور دیسی پلٹنوں کی وجہ سے شہر میں رونق ہے۔ چند بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ سیلون ہیں۔ جاپانیوں کے ریسٹاران بھی ہیں۔ شام ہو جانے کے سبب سے ہم مسلمان ہوٹل تک نہیں پہنچ سکے البتہ شہر سے باہر یہودی کے ہوٹل میں پہنچ گئے۔

آج صبح ہم نے جہاز پر صرف ناشتہ ہی کیا تھا۔ کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہم دونوں بھوکے تھے اور تکان محسوس کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ جلد کسی ہوٹل میں پہنچکر آرام کریں اور کھانا کھائیں۔ یہودی ہوٹل کی عمارت اگرچہ بڑی اور دو منزلہ ہے مگر سنسان علاقہ میں واقع ہے۔ ہم کو تو کہیں رات بسر کر لینے کی ضرورت تھی۔

یہودی مالک ہوٹل سے ہم جا کر ملے۔ وہ انگلش خوب بولتا تھا۔ مگر اس وقت ہمیں بڑی مایوسی اور صدمہ ہوا جب ہمیں اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ فوجی افسروں کے آجانے سے سب کمرے بھر گئے ہیں۔ ہم کو اس جواب سے بہت تکلیف ہوئی۔ رات ہو چکی تھی۔ نیا مقام تھا اور ہم نو وارد تھے، کہاں جگہ ڈھونڈتے پھرتے اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ یہاں کوئی ہماری زبان بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے پھر دوبارہ اس سے التجا کی کہ مہربانی کر کے ہمیں رات بسر کرنے کے لئے کہیں تھوڑی سی جگہ دیدیجئے۔ صبح ہوتے ہی ہم چلے جائیں گے۔ اس نے جواب دیا کہ ہوٹل میں تو کوئی جگہ خالی نہیں ہے جو آپ کو دی جا سکے البتہ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر ایک مکان ہے جو کچھ عرصہ سے خالی پڑا ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں جا کر ٹھہر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم کو صرف ایک رات بسر کرنے کے لئے جگہ چاہیئے خواہ کہیں بھی ہو۔ کھانا ہم نے ہوٹل میں کھایا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے کھانے اور ایک رات کے لئے مکان میں ٹھہرنے کا بل اس کو اسی وقت ادا کر دیا۔ یہودی نے مکان کی کنجی اور ایک روشن لالٹین دے کر اپنے ملازم کو مکان بتانے کے لئے ہمارے ساتھ کر دیا۔ وہ ایک غیر آباد اور ویران حصہ میں ہم کو لے گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مکان کی خستہ حالی دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔ ایک

خوفناک دہشت و وحشت اُس مکان پر برس رہی تھی۔ دو ایک مکان اور کچھ فاصلہ پر نظر آرہے تھے۔ عنایت نے اُسے دیکھ کر کہا کہ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ آج کی رات ہم کسی کھلی ہی جگہ پر گذار دیں۔ مجھے تو اس مکان کے اندر قدم رکھتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا جو عرصۂ دراز سے غیر آباد پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جب ہم قفل کھول کر اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ جا بجا جالے اور بڑے بڑے مکڑے موجود ہیں۔ کوڑے کرکٹ کا انبار لگا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس مکان میں برسوں سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔ ملازم ایک تنگ سیڑھیوں کے راستے سے ہم کو اوپر لے گیا۔ اوپر کے کمرے ہوادار ضرور تھے لیکن سب گرد آلود تھے۔ ملازم نے دو پلنگ جھاڑ کر بچھا دیئے اور درمیان میں ٹیبل رکھ دیا۔ ٹیبل پر لالٹین رکھ دی پھر دو بالٹیوں میں پانی بھر لایا اس کے بعد غسل خانہ میں کموڈ اور جگ وغیرہ درست کر کے چلا گیا۔ ہم نے نیچے جا کر دروازہ بند کر لیا اور بستر لگا کر لیٹ گئے۔ اس وقت ۸ یا ۹ بجے تھے۔

مسافرت میں اگر کوئی تکلیف کا وقت ہوتا ہے تو وہ یہی وقت ہے جب ایک مسافر کسی نئی جگہ اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوتا ہے اور وہاں کے حالات سے وہ کلیتاً ناواقف ہوتا ہے۔ یہی تکلیف اس وقت ہم کو

رہیش بھتی۔ زنبونگا میں اجنبی ہونے کی وجہ سے ہم اپنے آرام کی کوئی جگہ حاصل نہ کر سکے۔

یہودی نے اپنے تھوڑے سے نفع کے لئے ہم کو سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا جس سے ہم قطعی ناواقف تھے لیکن مالک مکان یقینی اپنے مکان کی حالت سے ناواقف نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ضرور مکان کی موجودہ حالت سے واقف رہا ہوگا۔ اُس نے ہمارے ساتھ انسانی ہمدردی بھی نہ کی جس کا ہم کو افسوس رہا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ بعض یہودی اکثر متعصب ہوتے ہیں اور اس کا شمار بھی اُنھیں میں سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ اُس کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔

میں یقین کے ساتھ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میرے دل میں بفضلہ خوف کی جگہ بہت کم ہے۔ میں دہشتناک جنگلوں اور خونخوار درندوں کے حملوں کے وقت بھی کبھی زیادہ ہراساں نہیں ہوا اور ہمیشہ اُن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہا۔

مگر آج کی رات جو ہم پر گذری، وہ میرے لئے بیحد سخت پریشان کن تھی۔ میں سخت خوف زدہ تھا۔ آج کی رات میرا مقابلہ شیروں یا ہاتھیوں سے نہ تھا، نہ کسی اور درندے سے تھا، بلکہ تمام شب جنوں اور بھوتوں نے مختلف شکلوں میں آ آ کر ہمیں خوف زدہ اور پریشان رکھا۔

یہ میں یقین سے ساتھ جانتا تھا کہ جن بھی ہم انسانوں کی طرح خدا کی ایک مخلوق ہیں جو دنیا میں ہر جگہ آباد اور حضرت آدمؑ سے قبل سے موجود ہیں جیسا کہ قرآن پاک سے بھی ثابت ہے مگر آج سے پہلے مجھے ان کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ کبھی ان سے واسطہ ہی پڑا تھا اور دیوں تو جنوں کے لاتعداد قصے اپنے بچپن سے سنتا چلا آرہا تھا۔ پنجاب کے جس قصبہ میں میری پرورش و پرداخت ہوئی ہے وہاں شاہی زمانہ کی بہت سی عمارتیں موجود ہیں جن کا کچھ حصہ غیر آباد اور خستہ حالت میں ہے وہاں اکثر جنوں کے مختلف محیّر العقول واقعات سُنکر مجھے بیحد تعجب ہوا کرتا تھا اور یقین نہ کیا کرتا تھا بلکہ یہ خیال کرتا تھا کہ یہ محض لوگوں کا مبالغہ ہے۔

اس وقت ہم دونوں کمرے کے اندر اپنے اپنے بستروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کوٹ اتار کر سرھانے رکھ لیا اسلئے کہ اس وقت تکیے ہمارے ساتھ نہ تھے۔ میں پاجامہ اور قمیص پہنے ہوئے تھا ہم دونوں خاموشی کے ساتھ نیند کا انتظار کر رہے تھے۔ باہر مکمل سنّاٹا تھا اور مکان کچھ عجیب بھیانک سا نظر آرہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عنایت پر اس کا بہت کچھ اثر ہے اور وہ خوف زدہ ہو رہا ہے۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے لیٹے لیٹے گانا شروع کر دیا جس سے

عنایت کی گھبراہٹ میں گو نہ کمی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد مجھے پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی غسل خانہ کا کمرہ ملحق ہی تھا اور اُس کے کچھ حصّے میں لالٹین کی روشنی بخوبی پہنچ رہی تھی اور باقی حصّے میں اندھیرا تھا۔ میں غسل خانہ میں جاکر بیٹھ گیا، اور پیشاب سے فارغ ہو کر جگ میں جو پانی موجود تھا اُس سے استنجا کیا اور جوں ہی میں اُٹھا میری نظر کمرے کے اُس کونے میں گئی جہاں اندھیرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں اندھیرے میں کوئی سیاہ سی چیز موجود ہے۔ لمبے لمبے بال ہیں جیسے سیاہ ریچھ ہو، اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں آگ کی طرح روشن تھیں۔ میں دیکھتے ہی خوف سے لرز گیا اور جوں ہی میں پیچھے ہٹا میرا پاؤں پھسل پڑا اور میرے ہاتھ سے جگ گر پڑا۔ میں نے آیۃ الکرسی پڑھنی چاہی مگر دہشت اس درجہ غالب تھی کہ نہ پڑھ سکا۔ میں جلد باہر آگیا اور لالٹین لے کر دوبارہ وہاں گیا لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ عنایت نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ آپ گھبرا کیوں گئے اور جگ کیسے گر پڑا ہے میں نے اس خیال سے اُس کو نہیں بتلایا کہ وہ اور خوف زدہ ہوجائیگا۔ اور اُس سے یہ کہہ دیا کہ کچھ نہیں میرا پیر پھسل گیا تھا اسی سے جگ میرے ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ پھر اُس سے کہا کہ اگر تم ڈر رہے ہو تو جب تک جاگتے رہو، کلمہ شریف پڑھتے رہو۔ میں نے خود بھی بستر پر بیٹھ کر آیۃ الکرسی، آیۂ کریمہ اور درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ عنایت بستر پر بیٹھا اپنے سر کو دونوں گھٹنوں میں کئے ہوئے منہ چھپائے کلمہ شریف پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دفعتاً چونکا اور چلا اُٹھا

کہ میری چارپائی کسی نے زور سے ہلا دی، کیا آپ ہیں ؟ لیکن آپ تو اُس وقت سے برابر اپنے پلنگ پر بیٹھے ہیں ۔ اب اُس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی ۔ میں نے اُس کو پھر تسلی و تشفی دی ۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ مکان ضرور جنوں کا مسکن ہے اور ہم خطرے میں ہیں ۔ تھوڑی دیر گذرنے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ ہم کو اس مکان کو خالی کر کے جلد از جلد نکل جانا چاہیئے ۔ ابھی میں نے اُٹھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ہمارے اُوپر چھت پر دھڑ دھڑ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں جیسے سیکڑوں آدمی کود رہے ہوں ۔

اب عنایت کی حالت زیادہ خراب ہو چکی تھی اور خوف کے مارے اُس کے منھ سے بات نہیں نکل رہی تھی ۔ میں نے اُس سے کہا، معلوم ہوتا ہے تم ڈر رہے ہو ۔ جلدی اُٹھو اور نیچے چلو ۔ جیسے ہی ہم بستر اور لالٹین لیکر اُٹھے سیڑھیوں کا دروازہ زور سے بند ہوا، اور ہمارے ڈھکیلنے اور زور کرنے پر بھی نہ کھلا ۔ مایوس ہو کر واپس لوٹے ۔ کمرے میں آنے کے بعد جو کھڑکیاں باہر کے رخ لگی ہوئی تھیں ہم نے انھیں کھولنے کی کوشش کی تاکہ آواز دیکر کسی سے امداد کے طالب ہوں لیکن وہ بھی نہ کھلیں ۔ اس وقت کی ہماری پریشانی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ ہم دونوں آدمی خوف سے کانپ رہے تھے اور حد درجہ پریشان تھے ۔ مگر کر کیا سکتے تھے ؟ اسی دہشت زدہ حالت میں ہم پھر بستر پر آکر بیٹھ گئے ۔

ہمارے بستر پر بیٹھتے ہی چھت پر امن ہوگیا۔ میں نے عنایت کے سامنے پھر اطمینان دلانے والی باتیں شروع کر دیں اور کہا کہ اس وقت جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس سے ہم کو مطلق خوف زدہ نہ ہونا چاہیئے۔ یہ ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے تم ڈرو مت اور اطمینان رکھو۔ تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ میں بستر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا، اور دل میں خیال کر رہا تھا کہ آج کی رات ہم پر عجیب مصیبت کی رات ہے۔ لیکن مجھے اپنے دل کو مضبوط رکھنا چاہیئے۔ دراصل ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ چاہے جتنا خوف ہم کو دلائیں مگر جان سے نہیں ماریں گے۔ ہم نے ان کا کوئی نقصان نہیں کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کو مختلف خوفناک شکلوں میں دیکھ کر ہم خود ہی دہشت سے مر جائیں۔

ان خیالات سے میرا دل قدرے قوی ہوگیا۔ ان کی حرکتوں سے میں یہ سمجھ چکا تھا کہ اس پراسرار مکان کے رہنے والے کوئی اونچے طبقے کے لوگ نہیں ہیں بلکہ کم درجے کے اور کمینے ہیں۔

انسانوں کی طرح جنوں میں بھی ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں۔ اونچے طبقے کے لوگ ہوتے تو ہم انسانوں سے شریفانہ برتاؤ کرتے۔ چنانچہ حسنِ اتفاق سے اسی رات میں مجھے دونوں طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑکر تجربہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر اسی پریشانی اور اسی حال میں گذری۔ پھر ہمارے

سامنے جو لالٹین میز پر روشن تھی، اس پر دھواں سا بڑھنا شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ وہ اتنا بڑھ گیا کہ سارے کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور لالٹین چھپ گئی۔ اس وقت میں نے پھر عنایت کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی اور وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے دونوں جبڑے اس طرح چل رہے تھے جیسے شدت کی سردی کے وقت انسان کانپنے لگتا ہے۔ جب بالکل اندھیرا ہو گیا تو لالٹین کے قریب بہت سی مختلف خوفناک شکلیں نمودار ہو گئیں۔ جن کی سرخ سرخ چمکتی ہوئی آنکھیں اس اندھیرے میں بلا کی دہشت پیدا کر رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر عنایت نے ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی بیہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔ مجھ پر بھی اتنا اثر ضرور تھا کہ جو کچھ میں پڑھنا چاہتا تھا، وہ میری زبان پر نہیں آ رہا تھا۔ منھ خشک تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور دل اندر سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ پانچ منٹ تک یہی حالت رہی، اس کے بعد وہ شکلیں غائب ہو گئیں اور دھواں اسی طرح آہستہ آہستہ کم ہو کر صاف ہو گیا۔ اب لالٹین پھر بدستور روشن تھی۔ میں نے عنایت کو اس کے بستر پر لٹا کر کمبل اڑھا دیا۔ اس وقت اس کا بیہوش رہنا ہی مجھ کو مناسب معلوم ہوا۔

میں نے اپنی گھڑی پر نظر کی تو ۱۲ بجے تھے۔ اللہ اللہ! مصیبت کی

رات بھی کتنی پہاڑ ہو جاتی ہے کہ کاٹے نہیں کٹتی۔ ان تمام ساتھیوں سے اتنے عرصے دو چار رہنے کے بعد بھی ابھی صرف ۱۲ ہی بجے ہیں۔ رات کے سناٹے میں مکان کے باہر اس قدر خاموشی تھی کہ کہیں سے بھی کسی کے بولنے کی آواز کان میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اسی عالم پریشانی میں پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے صحن میں مجھے بہت سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں سخت حیران تھا کہ یا الٰہی! یہ کیا مصیبت ہے۔ کچھ ہی دیر گذری تھی کہ نیچے سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی اور اس کے بعد مشکل سے ۵ منٹ ہوئے ہوں گے کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ سنائی دی اور فوراً بعد میں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک لمبے قد کا خوبصورت نوجوان شخص میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کو دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو گیا اور بہت قریب تھا کہ میرے دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ میں خوف سے لرز رہا تھا۔ مگر اس کی صورت سے خوف نہیں بلکہ شرافت ٹپک رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس پر اور بھی تعجب ہوا کہ وہ پنجابی لباس میں تھا۔ سفید شلوار۔ لمبا کوٹ اور سر پر لنگی باندھے تھا۔ اس نے آتے ہی ہندوستانی زبان میں کہا:۔

"یہ لیجئے آپکے نام کا خط ہے" اور یہ کہہ کر اس نے ایک چھوٹی سی چاندی کی تختی میرے ہاتھ میں دیدی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسکو

لے لیا۔ وہ میرے سرھانے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے تختی کو لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اُس پر زرد رنگ سے ذیل کے الفاظ درج تھے۔ "گھوڑا۔ سواری۔ دربار"۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ میرے چہرہ کا رنگ فق اور گلا خشک ہو رہا تھا۔ مُنھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ میں بمشکل اُس نوجوان سے کہہ سکا کہ "جی نہیں، یہ میرا خط نہیں ہے"۔ لیکن اُس نے پھر کہا کہ "یہ خط آپ ہی کا ہے"۔ میں نے کہا کہ "اگر یہ خط میرے نام کا ہے تو میں اس وقت تک اس کا مطلب قطعی نہیں سمجھ سکا"۔ اُس نے جواب دیا کہ پہلا لفظ گھوڑا ہے۔ نیچے گھوڑا موجود ہے۔ دوسرا لفظ سواری ہے۔ آپ اُس پر سوار ہو جائیں۔ اُس کی زبان سے یہ سُنکر میں بہت گھبرایا اور پوچھا کہ آپ مجھے کہاں اور کس کے پاس لے چلیں گے؟ اُس نے جواب دیا کہ اپنے بادشاہ کے دربار میں۔ آپ گھبرائیے نہیں اور اطمینان کے ساتھ چلیئے۔ آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا اور جلد ہی یہاں واپس بھیجدیئے جائیں گے اس سے زیادہ مجھے گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے جبراً و قہراً کوٹ اور جوتا پہنا اور تیار ہو کر اُس کے ہمراہ مکان کے نیچے اُترا۔ جب صحن میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ نوجوان تو غائب ہے مگر صحن میں ایک نہایت شاندار سیاہ رنگ کا گھوڑا کھڑا ہے۔ جس کی آنکھیں نہایت چمکدار ہیں۔ زین کسی ہوئی ہے۔ گھوڑا بے چینی سے بار بار اپنی ٹانگوں اور

اور گردن کو حرکت دے رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن اب کم تھی۔ خوف میں بھی بڑی حد تک کمی ہو گئی تھی۔ چند منٹ تک میں نے نوجوان کا انتظار کیا پھر گھوڑے کی بے چینی زیادہ دیکھ کر میں اُس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ میرے سوار ہوتے ہی گھوڑے نے ایک جست لگائی اور ہوا میں پرواز کرنے لگا تاریکی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہ آتا تھا۔ میری حالت جو کچھ اس وقت تھی بیان نہیں کی جا سکتی۔ باوجود انتہائی کوشش کے بھی مجھے قطعی علم نہیں ہو سکا کہ میں کس سمت کو جا رہا ہوں بجز اس کے کہ فضا میں تیزی کے ساتھ اُڑا چلا جا رہا تھا اور تن بہ تقدیر لگام تھامے سہما ہوا بیٹھا تھا الغرض اسی طرح میں نے جنگلوں اور پہاڑوں پر سے گذرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ گھوڑا نیچے اُتر رہا ہے۔ چنانچہ وہ درختوں کے درمیان ایک سبزہ زار میدان میں جا کر ٹھہر گیا۔ میں گھوڑے سے اُتر کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ پھر وہی نوجوان میرے سامنے آگیا میرے دل پر خوف و ہراس کا قطعی اثر نہ تھا بلکہ برعکس اس کے میں خوش تھا کہ خوش قسمتی سے مجھے آج ایک نئی دنیا کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوگا۔ میں نے نوجوان سے اظہار تعجب کرتے ہوئے کہا کہ آپ مجھ سے پہلے یہاں کس طرح پہنچ گئے درانحالیکہ گھوڑے نے اپنی پوری تیز پروازی سے مجھے یہاں پہنچایا ہے۔ میں گھوڑے کی طرف اشارہ کر کے اسکی تعریف کرنا چاہتا تھا کہ دیکھا گھوڑا غائب تھا اب میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ نوجوان نے میرے سوال کا کچھ جواب نہ دیا اور

مسکرا کر کہا کہ آپ میرے ساتھ ساتھ چلے آیئے ہم دونوں اندھیرے میں درختوں کے درمیان میں سے ہو کر گذر رہے تھے اور میں رہ رہ کر خیال کر رہا تھا کہ دیکھیے دربار شاہی میں میں کس غرض سے طلب کیا گیا ہوں اور وہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے اگرچہ اس جانب سے مجھے کامل اطمینان تھا کہ مجھ سے کوئی بدسلوکی نہ کی جائے گی اور جس کا اس نوجوان نے بھی اطمینان دلایا ہے تاہم میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں آداب شاہی وغیرہ سے ناواقف ہوں خدا جانے ان کا شاہی دربار کسقدر شاندار ہوگا۔ عالیشان محل ہوں گے۔ باغات اور چمن ہوں گے۔ بیشمار قیمتی ساز و سامان سے دربار اور محل آراستہ ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر ضرور شاہی رعب غالب ہو جائے گا اور میں کوئی بات نہ کر سکوں گا۔ میں انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا کہ وہ نوجوان مجھے ساتھ لئے ہوئے درختوں سے نکل کر ایک کھلے میدان میں پہنچا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ایک مقام پر بہت سی چٹانوں کے درمیان پہنچکر رک گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ٹھہر گیا۔ وہاں دھیمی سی روشنی تھی۔ جیسے آخری تاریخوں کے چاند کی ہوتی ہے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اس میدان میں بے شمار بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں پڑی ہیں اور ان پر بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ کچھ لوگ سبز گھاس پر بھی دور تک بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے جو بہت ہی آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ لباس سب کا ایک سا تھا۔ سب سفید لمبے کرتے پہنے ہوئے اور ننگے سر

تھے میں کھڑا ہوا سب کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میری طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ سامنے گھنا جنگل اور بلند پہاڑ تھے اور بڑے بڑے پرانے درخت کھڑے تھے۔

نوجوان نے مجھے ایک خالی پتھر پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور وہ خود بھی میرے برابر والے پتھر پر بیٹھ گیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں، یہ لوگ کون ہیں اور یہاں کیوں جمع ہیں؟ یہ سب شکل و شمائل میں مہذب انسانوں کی طرح تھے البتہ ان کی آنکھیں جداگانہ تھیں جو شیر کی آنکھوں کی مانند چمکدار مگر زرد رنگ کی تھیں۔ ان میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ان لوگوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ پھر سب خاموشی سے تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے میں بھی اُن کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ نوجوان نے مجھ سے کہا کہ ہمارے بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں۔ یہ جملہ ابھی تمام بھی نہ ہوا تھا کہ ایک سات فٹ لمبا مگر دبلا پتلا شخص آ کر ایک درمیان کے پتھر پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ اور اُس کے دربار کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں تو اپنے دل میں خیال کر رہا تھا کہ جنوں کے بادشاہ کا دربار نہایت ہی پُرتکلف و شاندار ہو گا۔ مگر یہاں تو نہ کوئی محل تھا اور نہ مکان۔ نہ فرش تھا اور نہ کوئی اور زینت و آرائش۔ ان کے

علاوہ کوئی شاہانہ شان و شوکت بھی نہ تھی۔ بادشاہ کا لباس بھی بالکل سادہ دوسرے لوگوں کی طرح ایک لمبا کرتا تھا۔ وہ بھی ننگے سر تھے۔ داڑھی لمبی تھی اور آنکھیں چمکدار و زرد۔ بادشاہ کے بیٹھتے ہی سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش و مودب بیٹھ گئے۔ اس نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بادشاہ کے سامنے کھڑا کر دیا میں نے بادشاہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اُن کی بارعب صورت دیکھتے ہی میرے دل پر شاہی رعب غالب ہو گیا۔ میں نے سلام کے لئے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور نیچی نظریں کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ تمام دربار پر سناٹا تھا اور سب خاموش تھے۔

بادشاہ نے بڑی آہستگی اور بہت ہی نرم آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ اے..... انسان! اے..... بنی آدم! خوش آمدی و صفا آوردی۔ تم کو دیکھ کر ہم بہت مسرور ہوئے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، ہم کو معلوم ہوا کہ تم یہودی کے مکان میں ٹھہرے ہو اور وہاں تم کو ہماری قوم کے بھتنوں نے دق کر رکھا ہے۔ چنانچہ ایجانب نے فوراً اپنا حاضر بھیجکر اُن کی اصلاح کر دی ہے اب وہ لوگ تمھیں دق و پریشان نہیں کریں گے۔ یہاں آنے کی تکلیف تم کو اس لئے دی گئی ہے کہ ما بدولت تم کو دیکھنا چاہتے تھے۔ تم انسان ہو، لیکن بہت دلیر۔ ایجانب تمھاری بہادری سے بہت خوش ہیں تم کو

شاید اس کا علم نہ ہو، مگر مابدولت بخوبی واقف ہیں کہ تم نے اپنجانب کی قوم کی تم نے اپنے افریقہ کے قیام کے زمانہ میں کمال بہادری سے مدد کی تھی اور وہ اس طرح پر کہ تم نے وہاں ایک بہت بڑے اور پرانے سانپ کو جس نے ہماری قوم کے مسکن یعنی غار پر مدت ہائے دراز سے قبضہ کر رکھا تھا مار کر ہلاک کر دیا تھا جس سے ہم سب تمہارے ممنون ہیں۔ تمہارے اس کارنامہ کو مابدولت سے ملک معظم افریقہ نے انتہائی مسرت سے خصوصیت کیساتھ بیان فرمایا تھا۔

پھر ارشاد فرمایا کہ تم کو بخوبی یاد ہو گا کہ انھیں دنوں میں تم نے ایک سیاہ رنگ کے بلے پر بھی وار کیا تھا اور وہ بچ گیا تھا وہ ہماری قوم کا ایک فرد تھا۔ اس نے تمھیں ضرور نقصان پہنچایا ہوتا مگر چونکہ تمھارے بازو پر اسم اعظم بندھا ہوا تھا اسلئے تم اسکے حملے سے محفوظ رہے اور تمھارا بال بیکا نہ ہو سکا جو آج بھی تمھارے پاس موجود ہے۔ میں رعب غالب ہو جانے کے باعث کچھ جواب نہ دے سکا اور سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے بعد بادشاہ نے فرمایا کہ اب مابدولت تم کو اس سے زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتے۔ جاؤ واپس جاؤ۔ بادشاہ کے ساتھ ہی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ نوجوان اسی راستہ سے مجھ کو لیکر واپس ہوا۔

درختوں سے باہر گھوڑا موجود تھا۔ میرے سوار ہوتے ہی وہ ہوا میں بدستور اڑنے لگا اور بات کی بات میں مجھے مکان کے صحن میں اتار دیا۔ میرے اترتے ہی وہ وہاں سے غائب تھا۔

میں سیڑھیوں کے راستہ سے اُوپر آیا۔ لالٹین بدستور جل رہی تھی۔ عنایت اُسی طرح بیہوش پڑا ہوا تھا۔ اُس کے بدن پر ہاتھ رکھا تو اُسکو تیز بخار تھا۔ گھڑی میں دیکھا تو ۴ بج چکے تھے۔ اور سارے مکان میں ایک عمدہ قسم کی خوشبو آرہی تھی جو تیز لوبان کی خوشبو سے بہت کچھ مشابہت رکھتی تھی۔ آخر صبح ہوگئی اور دن نکل آیا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی تو اب وہ آسانی سے کھل گئی۔ باہر لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔ ہاتھ منہ دھوکر میں نے عنایت کو اُٹھایا۔ کچھ دیر میں اُس کو ہوش ہوا۔ اُس نے بھی منہ ہاتھ دھویا۔ پھر اس مکان سے نکلکر مسلمان ہوٹل کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچگئے اور اوپر کی منزل میں ایک کمرہ لے کر اُس میں ٹھہر گئے۔ عنایت کو بستر پر لٹا دیا۔ ناشتہ اور کافی منگوائی۔ گذشتہ رات کے عجیب وغریب واقعات کا اثر میرے دل پر بہت زیادہ تھا اور رات بھر کا جاگا بھی ہوا تھا، دن بھر بستر میں پڑا رہا اور کچھ دیر سوتا بھی رہا۔

دوسرے دن ۱۰ بجے کے قریب میں کسٹم ہاؤس سے اپنا سامان جاکر لے آیا۔ منیلا جانے والے جہاز میں ابھی ایک ہفتہ کا عرصہ تھا جہاز کمپنی سے میں نے واپسی کا جمع شدہ کرایہ واپس لے لیا۔ تیسرے روز عنایت کی حالت بہتر ہوگئی۔ اب وہ اچھا تھا۔ اُس کے دل پر

اُس مکان کے خوفناک واقعات کا کافی اثر تھا۔ ہم نے ان واقعات کا وہاں کسی سے ذکر نہیں کیا۔

جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے تھے تو وہ کوئی بڑے پیمانہ کا ہوٹل نہ تھا اور اس کا مالک قادر خاں مسلمان راجپوت ضلع لودہانہ کا باشندہ تھا جو پولیس میں ملازم تھا۔ عنایت اور وہ ایک ہی برادری کے لوگ تھے۔ یہ باہم ملکر بہت خوش ہوئے۔

باب سترھواں

اصلی باشندے

جزائر فلپائن میں سب چھوٹے اور بڑے، آباد اور غیر آباد کُل جزیرے سات ہزار کے قریب ہیں جن میں ۳ ہزار آباد ہیں باقی ۴ ہزار غیر آباد پڑے ہیں۔ جو جزیرے آباد ہیں، ان میں سب سے بڑا لوزان ہے۔ جو بالکل شمال میں واقع ہے، اور اس کا رقبہ تقریباً ۴۰ ہزار مربع میل ہے۔ اس کا بڑا شہر منیلا ہے جو فلپائن کا صدر مقام

بھی ہے۔ اس کے بعد دوسرا نمبر منڈناؤ کا ہے جو بالکل جنوب میں واقع ہے اور اس کا رقبہ ۳۶ ہزار مربع میل ہے۔ اس کا بڑا شہر زنبونگا ہے۔ ان دونوں جزیروں کے بعد پھر اور جزیرے منڈورو۔ پراگوا۔ سمار۔ پینائی نیگورو۔ صیبو۔ بھول وغیرہ ہیں جو چھوٹے بڑے ملاکر ۳ ہزار ہیں۔ ان کے علاوہ ۴ ہزار جزیرے فلپائن میں اور بھی ہیں جو غیر آباد ہیں اور وہ سب کچھ بہت بڑے جزیرے نہیں ہیں۔ ان کے غیر آباد پڑے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے انسانی آبادی کی بقا کے لئے وہاں کوئی سامان ہی نہیں فراہم کیا ہے۔ راک۔ پتھر۔ خشک چٹیل پہاڑ ہر جگہ بہ کثرت ہیں اور آتش فشاں پہاڑ کے سلسلے بھی ہر حصے میں پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر وقت دھواں نکلتا رہتا ہے۔ زمین کا کوئی حصہ ایسا ہموار نہیں ہے جو کاشت کے قابل ہو۔ وہاں نہ درخت ہیں اور نہ کسی قسم کی سبزی۔ پانی عنقا ہے اور زمین ہمیشہ تپتی رہتی ہے۔ پھر جن مقامات کی یہ کچھ حالت ہو وہاں انسانی آبادی کا وجود کیسے ممکن ہے۔ انسان تو انسان وہاں کسی جانور کا بھی نام و نشان نہیں ہے اور وہ سب غیر آباد پڑے ہوئے ہیں۔

جو جزیرے آباد ہیں ان میں پیداوار خوب ہوتی ہے۔ اور تمباکو۔ ربڑ اور ناریل بھی بہ کثرت پیدا ہوتے ہیں۔ جنگلوں سے مختلف اقسام کی

عمارتی لکڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان جزائر میں سب سے بڑی پیداوار ہیمپ کی
ہے۔ ہیمپ ایک درخت کے ریشے سے نکالا جاتا ہے جس کا درخت کیلے
کے پیڑ سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ اس کے ریشے سے جہازوں کے رسے معمولی
رسے اور کپڑے بنائے جاتے ہیں جن میں ریشم کی مانند چمک ہوتی ہے۔
ہندوستان میں جاپان سے جو بے حساب نقلی ریشمی فینسی کپڑے آرہے ہیں
اور ریشم کے نام سے بہت سستے داموں بک رہے ہیں وہ سب اسی ہیمپ
ہی کے ہیں جن کے بڑے بڑے کارخانے وہاں ہیں۔ کوئلہ۔ لوہا۔ چاندی اور
تانبے کی کانیں بھی ان جزائر میں اکثر مقامات پر ہیں۔ اس حصہ ملک میں آتش فشاں
پہاڑوں کی کثرت ہے جو کبھی کبھی پھٹ کر ارد گرد کی آبادیوں پر قیامت ڈھاتے
رہتے ہیں۔ زلزلوں کا بھی انھیں کے سبب سے دور دورہ رہا کرتا ہے۔ آب
وہوا معتدل ہے۔ نومبر سے جنوری تک موسم سرد رہتا ہے۔ باقی حصہ سال
میں بھی موسم چنداں زیادہ گرم نہیں ہوتا۔ یہاں کے باشندے شکل صورت
میں ملائی لوگوں سے ملتے جلتے ہیں جو فلیپینو کہلاتے ہیں۔ لباس ان کا مغربی
طرز کا کوٹ، پتلون اور ہیٹ ہے۔ عورتوں کی پوشش ہسپانیہ فیشن کی ہے
ڈھیلا گون۔ چھوٹی جیکٹ اور سر ننگا۔ بعض عورتیں سروں پر ریشمی رومال بھی
استعمال کرتی ہیں۔ مذہباً سب رومن کیتھلک عیسائی ہیں اور اکثر لوگ مذہب
کے پابند ہیں اور گرجے آباد ہیں۔ شہری زبان عام طور پر ہر جگہ ہسپانیہ کی

زبان سپینش ہے ہسپانوی گورنمنٹ ان جزائر میں تقریباً سوا تین سو برس تک حکمراں رہی ۱۸۶۹ء میں اُس کا ان جزائر پر قبضہ ہوا تھا۔ اور ۱۸۹۸ء میں یہ جزیرے اہلِ ہسپانیہ کے ہاتھوں سے نکل کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ گورنمنٹ کے قبضہ میں آگئے۔ تقریباً چالیس برس سے فلپائن کے تمام جزائر امریکہ گورنمنٹ کے تحت میں ہیں۔ امریکہ گورنمنٹ کو ان جزائر پر قابض ہونے کے بعد ان کے اصلاح کی جانب بہت زیادہ توجہ کرنی پڑی اس لئے کہ گورنمنٹ ہسپانیہ نے انھیں نہایت بتر حالت میں چھوڑا تھا۔ موجودہ حکومت کے دور میں یہاں ہر شعبہ میں نمایاں اصلاح و ترقی ہوئی ہے۔ خصوصاً تعلیم صنعت و حرفت۔ تجارت و زراعت کی جانب خاص توجہ ہے۔ مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے۔ جا بجا صنعت و حرفت کے کارخانے جاری کر دیئے گئے ہیں اور زراعت کو بھی بڑی ترقی دی گئی ہے جس سے تمباکو۔ ہمپ اور ناریل کی پیداوار میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے ہر مقام پر آمد و رفت کے لئے پختہ سڑکیں بنا دی گئی ہیں۔ اکثر جگہوں پر ریلیں بھی جاری ہیں۔ بڑے شہروں کی ان اصلاحات کی بدولت ایسی بہتر حالت ہو گئی ہے کہ حالتِ سابقہ سے انھیں اب کوئی مناسبت ہی نہیں۔ الغرض اس تھوڑے ہی زمانے میں گورنمنٹ امریکہ نے اپنے نظم و نسق سے ان جزائر میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

مسلمانوں کی آبادی صرف جزیرۂ منڈناؤ میں ہے جو وہاں تقریباً دس لاکھ کی تعداد میں بستے ہیں، ان کی اقتصادی حالت چنداں بہتر نہیں ہے اور وہ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں۔ منڈناؤ میں تجارتی کاروبار امریکن۔ فلپینو اور چینیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں کے مسلمان باشندے مور کہلاتے ہیں جو عربوں اور ملائیوں سے بہت مشابہ ہیں۔ ان کا لباس تنگ پائجامہ۔ چھوٹا اور تنگ کوٹ۔ سر پر رومال یا ٹوپی۔ پان اور تمباکو کھانے کے بڑے عادی ہیں جس سے عورتوں اور مردوں کے دانت سیاہ نظر آتے ہیں۔ تعلیم میں ہندوستان کی طرح اور قوموں سے بہت پیچھے ہیں، البتہ مذہب کے پابند ہیں۔ شہر میں چند مسجدیں ہیں اور سب آباد ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ غریب ہیں مگر بڑے شجاع و بہادر ہیں۔ امریکن فوجوں کا انھوں نے دلیرانہ مقابلہ کیا تھا۔ ان کی وجہ سے زنبونگا بڑی فوجی چھاؤنی ہے اور چند جنگی جہاز بھی بندرگاہ میں موجود رہتے ہیں۔

باب اٹھارواں

رحمت خاں کی تلاش

ایک روز شام کو کھانا کھانے کے بعد عنایت نے مجھ سے کہا، کہ میں ایک واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں، ذرا توجہ سے آپ اس کو سنیں۔ پنجاب میں ہمارے گانوں سے ۵ کوس کے فاصلہ پر ایک گانوں میں میری خالہ کا مکان ہے۔ وہاں اُن کی ذاتی زمینداری ہے۔ عرصہ ہوا میرے خالو کا انتقال ہو چکا ہے۔ اُن کے صرف ایک لڑکا رحمت خاں نامی تھا۔ باپ کے انتقال کے وقت اُس کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ ماں کی زندگی کا وہی ایک سہارا تھا۔ پانچ برس کے بعد وہ ماں کی رضامندی کے بغیر گھر سے کچھ روپیہ لے کر پردیس کو نکل گیا۔ اُس کی جدائی کے صدمے سے ماں کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ ڈیڑھ یا تین برس کے بعد ہانگ کانگ اور پھر منیلا سے اُس کے خطوط گھر پہنچے۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنی ماں کے پاس کچھ روپیہ بھی بھیجتا رہا۔ اب تین برس سے اُس کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے اور زندہ ہے یا مر گیا۔

اُس کی غریب بیوہ ماں کی بہت بُری حالت ہے۔ مجھے قادر خاں کی زبانی آج معلوم ہوا کہ تین سال کا عرصہ گزرا یہاں رحمت خاں نامی ایک نوجوان منیلا سے آیا تھا وہ تاجے کی کان میں ملازم ہوکر کاٹوباٹا کی طرف چلا گیا۔ وہ راجپوت اور ضلع جالندھر کا رہنے والا تھا۔ لیکن پھر اس کے بعد اُس کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور نہ وہ یہیں کہیں نظر پڑا۔ عنایت نے کہا کہ جب سے میں نے قادر خاں سے یہ خبر سنی ہے میرے دل میں ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی ہے اور طبیعت چاہتی ہے کہ جس طرح ممکن ہو میں رحمت خاں کو تلاش کرکے اُسے وطن روانہ کرنے کی کوشش کروں اور اس معاملہ میں میں اپنی خالہ کی مدد کروں۔ لہذا مہربانی فرماکر آپ مجھے اجازت دیدیجئے کہ میں کاٹوباٹا میں جاکر اُسکی تلاش کروں۔ آپ منیلا تشریف لے جائیں، میں جلد سے جلد وہاں حاضر ہوجاؤں گا۔

عنایت سے یہ سُنکر میں متاثر ہوا، لیکن میں اُس کو فوراً کوئی جواب نہ دے سکا، البتہ یہ کہدیا کہ اس معاملہ کا سوچنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا۔ چنانچہ شب کے وقت میں بستر پر پڑا ہوا دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا اور اس اجنبی ملک میں عنایت کو تنہا چھوڑ دینا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ پردیس تھا، نئی جگہ تھی اور عنایت انگریزی و مقامی دونوں

زبانوں سے ناواقف تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود بھی عنایت کے ساتھ ہولوں اور رحمت خاں کی تلاش میں اُس کی مدد کروں۔ اس فیصلہ کے بعد میں نے سردست ملیلا جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

جب میں نے اپنا فیصلہ عنایت کو سُنایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہم نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ مقام کاٹوباٹا جزیرہ منڈناؤ میں ایک مشہور شہر اور بندرگاہ ہے۔ وہاں سے اوپر پہاڑوں میں چند روز کی مسافت پر تانبے کی کانیں ہیں۔ پوہومل برادرس کے منیجر اکثر تقاضہ کرتے تھے کہ اپنی تھیلی جو امانت میں رکھی ہے واپس لے جایئے۔ میں نے اُن سے ایک ماہ اور اُس کے رکھنے کی درخواست کی۔ ہم نے قادر خاں کے ذریعہ سے ایک مقامی مور مسلمان کو تلاش کر لیا جو امریکن پلیٹن میں رہنے کی وجہ سے کچھ انگریزی بول لیتا تھا۔ اُس کا نام خالدو تھا۔ میں نے اُس کو ایک مہینہ کیلئے ملازم رکھ لیا۔ مختصر سامان، ہلکے بستر اور رائفل ساتھ لے لی۔ بقیہ سامان قادر خاں کے سپرد کر کے خالدو کے توسط سے ایک بادبانی جہاز کا انتظام کیا اور دوسرے دن صبح ہی ہم نے کھانے پینے کا سامان لیا اور جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ ۱۱ بجے کے قریب

ہم ایک چھوٹے سے جزیرہ باسیلان پہنچے۔ یہاں جہاز نے ۴ گھنٹہ قیام کیا۔ ہم خشکی پر اتر گئے اور ادھر اُدھر گھومتے پھرے۔ عنایت کی نظریں یہاں بھی ہر طرف رحمت خاں کی متلاشی تھیں۔ سمندر کے ساحل ہی پر ایک چھوٹا سا بازار اور فروٹ مارکیٹ ہے۔ ہم نے یہاں سے کچھ میوے خریدے اور جہاز پر واپس آگئے۔ چند فلپینو مسافر یہاں سے جہاز پر سوار ہوئے اور ۴ بجے شام کو جہاز روانہ ہو گیا۔ ان نئے مسافروں میں ایک فلپینو مسافر انگریزی خاصی جانتا تھا۔ میں نے اس سے سپینش زبان کے بہت سے الفاظ معلوم کر کے نوٹ کر لئے۔ تمام رات جہاز چلتا رہا، دوسرے دن ۴ بجے شام کے قریب کاٹو باٹا بندرگاہ پر جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ ہم جہاز سے اتر کر آبادی میں داخل ہوئے ایک ریسٹارینٹ میں پہنچے، کھانا کھایا۔ اس کے بعد خالد وہ مکان کی تلاش میں چلا گیا، جہاں سے ایک گھنٹہ بعد واپس آیا۔ ہم اُس کے ساتھ ہو لئے۔ اُس نے ایک فلپینو کے مکان میں ایک کمرہ کا انتظام کر لیا تھا، جو ہمارے لئے کافی تھا۔ کاٹو باٹا پر رونق مقام ہے۔ مسلمانوں کی آبادی خاصی ہے۔ فلپینو اور چینی بھی ہیں، اور کچھ امریکن بھی آباد ہیں۔ فلپائن کا مروجہ ڈالر جو کا ہے جسے یہاں پیسو کہتے ہیں۔

ہم کو جنگل میں چالیس پچاس میل پیدل سفر کرنا تھا۔ کوہ الیپو کے قریب تانبے کی کانیں ہیں۔ وہاں رحمت خاں ملازم ہو کر گیا تھا۔ ہم نے کاٹو باٹا میں دو روز قیام کیا، اس دوران میں عنایت اپنے بھائی کو تمام آبادی میں تلاش کرتا پھرا۔

تیسرے دن ہم نے صبح ہی پا پیادہ کوہ الیپو کی جانب کوچ کر دیا۔ دوپہر کے بعد ہم ایک گاؤں میں پہنچے اور رات وہیں بسر کی۔ دوسرے دن صبح ہم پھر روانہ ہوئے۔ جزیرۂ منڈناؤ میں پہاڑ اور جھیلیں کثرت سے ہیں۔ جھیلوں کی وجہ سے ہر حصہ سرسبز و شاداب ہے۔ پہاڑی علاقوں میں عمیق خندقیں اور غار بہت ہیں جن میں بڑے بڑے سانپ بافراط ہیں۔ کوہ الیپو کے نواح میں ایک بڑی جھیل ہے جو میلوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس راستہ پر ہم اس وقت جا رہے تھے یہ جھیل کے کنارے کنارے عام راستہ ہے۔ لوگ برابر آ جا رہے تھے۔

تیسرے روز ہم اسی راستہ پر چلے جا رہے تھے، دوپہر ڈھل چکی تھی اور کچھ تکان معلوم ہو رہی تھی، ایک مقام پر پہنچ کر ہم رک گئے اور درختوں کے سائے میں آرام لینے کی غرض سے بیٹھ گئے۔ اس وقت ہمارے داہنی جانب لمبی چوڑی جھیل تھی اور بائیں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جو دور تک زمردیں لباس پہنے ہوئے اپنے پیر پھیلائے

ہوئے تھیں اور ہمارے سامنے کوہ الپس کی سربلند پہاڑیاں تھیں جو اپنی بلندی پر نازاں نظر آرہی تھیں۔ یہاں سے ہماری منزل صرف چند گھنٹوں کی راہ تھی۔ ہم کچھ دیر تک یہاں آرام کرتے رہے اور دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ہم یہاں سے روانہ ہونا ہی چاہتے تھے کہ بائیں جانب قریب ہی پہاڑی کے دامن میں شور و غل ہوا اور کسی آدمی کے چلانے اور رونے کی آواز سنائی دی ہم کھڑے ہو کر اس طرف متوجہ ہو گئے اور متجسس نگاہوں سے اُدھر دیکھنے لگے۔ ہمیں دُور پر ایک شخص نظر پڑا جو بے تحاشا اسی طرف تیزی سے بھاگا چلا آرہا تھا۔ جب قریب آگیا تو ہم نے دیکھا کہ وہ عجیب خوفناک صورت کا انسان ہے۔ داڑھی اور سر کے لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے ہیں اور منہ خون سے تربتر ہے۔ جسم کے کچھ حصہ پر ٹاٹ لپیٹے ہے اور باقی ننگا ہے۔ ہاتھوں کے ناخن لمبے لمبے ہیں۔ بالکل ایک بھوت کی شکل بنائے اسی طرح دوڑتا ہوا ہمارے پاس سے گذرا اور جھیل کے کنارے پہنچ گیا اور پہنچتے ہی دھڑام سے پانی میں کود پڑا اور تیرتا ہوا ہماری نظروں سے غائب ہو گیا اور ہم کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ہم حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ تھا اور وہ انسان تھا یا جن۔ جاتے وقت وہ اس تیزی سے گیا کہ اس نے آنکھ اُٹھا کر بھی ہماری طرف نہ دیکھا

تھوڑی دیر کے بعد ہم اس طرف کو روانہ ہو گئے، جدھر سے

رونے کی آواز آئی تھی کہ شاید وہاں جاکر کچھ حال معلوم ہو۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک نوجوان مسلمان زمین پر پڑا کراہ رہا ہے۔ اُس کا داہنا کان کٹا ہوا ہے اور اُس سے خون جاری ہے۔ ایک عورت اور ایک چھ سات سالہ لڑکی اُس کے آس پاس بیٹھی رو رہی ہیں۔ خالد و نے اُن سے دریافت حال کیا تو اُنھوں نے روتے ہوئے بیان کیا کہ ایک جنگلی بھوت ان کا آدھا کان کاٹ کر کھا گیا اور اس کے بعد وہ ادھر ہی بھاگ گیا۔ یہ سُنکر ہمیں سخت حیرت ہوئی اور کچھ نہ سمجھ سکے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ بھوت تھا اور کان کاٹ کر کھا گیا! یہ ایسا معمّہ تھا جس نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا اور دیر تک سوچا کئے کہ وہ کون تھا؟ ہو نہ ہو وہ ضرور جن تھا، اس لئے کہ ان جزیروں میں جنوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر خیال کر رہا تھا کہ ایک جن کا انسانی کان کاٹ کر کھا جانا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو عقل قبول نہیں کرتی۔ اُس غریب کے داہنے کان کا نصف بالائی حصہ غائب تھا اور خون اب تک جاری تھا۔ ہم نے اُس زخمی آدمی کو اُٹھایا اور پانی کے قریب لاکر اُس کے زخم کو صاف کیا پھر اپنا رومال پھاڑ کر اُس کا زخم باندھ دیا۔ اُس آدمی نے کہا کہ ہم لوگ اپنے گاؤں کو جو یہاں سے صرف ایک میل کے فاصلہ پر ہے جا رہے تھے کہ اچانک بھوت نے حملہ کر دیا۔

میرے سر میں درد تھا اور طبیعت کچھ ناساز سی معلوم ہو رہی تھی اس لئے منزل کی طرف بڑھنے کے ارادہ کو ملتوی کر دیا اور آرام لینے کے خیال سے انھیں لوگوں کے ہمراہ ان کے گاؤں کی طرف عنایت و خالد کو لئے ہوئے روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی مو مسلمانوں کی بستی تھی جس کی آبادی ہزار ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ لکڑی، بانس اور گھاس سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے سطح زمین سے کچھ بلندی پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ تمام مکانات اور راستے صاف تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالے پہاڑوں سے نکلکر بستی کے وسط سے گذرتے ہوئے جھیل میں جا کر ملگئے تھے جن سے اطراف کی آراضیاں و پہاڑیاں سرسبز و شاداب تھے اور دور تک ہرے بھرے دھان کے کھیت لہرا رہے تھے۔

گاؤں میں پہنچکر یہ غریب زخمی ہمیں اپنی جھونپڑی میں لے گیا جہاں عورت نے ہمارے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ خالی کر کے صاف کر دیا۔ کمرہ کا فرش بانس کا تھا عنایت نے اسی پر میرا بستر لگا دیا۔ اس مکان کا مالک غریب اور کاشتکار معلوم ہوتا تھا۔ میں نے عورت کو جو ساتھ آئی تھی اپنے سامنے بلوایا اور چار ڈالر (پیسو) اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ جو کچھ تم جلدی سے پکا سکتی ہو تیار کر لو۔ وہ چاندی کے ان ڈالروں کو پاکر بہت ہی خوش ہوئی اور جلدی سے مچھلی اور چاول پکا کر لے آئی۔ بازار سے کیلے اور نارنگیاں وغیرہ میں نے منگا لیں

اور ہم سب نے ملکر کھانا کھایا۔

فلپائن کے تمام جزائر میں عام طور پر لوگوں کو مرغ لڑانے کا بے حد شوق ہے اس لئے وہاں ہر جگہ مرغ بکثرت ہیں اور ان کی لڑائی کے اکھاڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹی چھوٹی بستیوں تک میں موجود ہیں۔ یہ ایک وسیع مکان ہوتا ہے جو عموماً گول بنایا جاتا ہے اور اسی کے درمیانی حصہ میں مرغوں کی لڑائی کا میدان ہوتا ہے جس کے چاروں طرف تماشائیوں کے بیٹھنے کے لئے گیلری بنی ہوتی ہے۔ لڑائی کے وقت مرغ کی ایک ٹانگ میں زہر سے بجھا ہوا نشتر باندھ دیتے ہیں اور پھر مقابلہ کے لئے دونوں کو میدان میں چھوڑ دیتے ہیں، جس سے دو ہی چار منٹ میں ایک مرغ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مرغوں کی اس لڑائی میں بھی گھوڑ دوڑ کی طرح نقدی کی بازی لگائی جاتی ہے یعنی جوا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ تمام دن جاری رہتا ہے۔ اہل ہسپانیہ کی یہ یادگار ہنوز اس ملک میں باقی ہے۔ اس مکان اور اکھاڑے کا نام یہاں گلجرا ہے۔ یہ مسلمانی بستی بھی اس گلجرے سے خالی نہ تھی۔ ہر اتوار کے دن مرغ بازی کا یہ دنگل ہوا کرتا ہے اور اتفاق سے آج اتوار تھا۔

۴ بجے شام کے وقت خالد نے کہا کہ چلئے تھوڑی دیر کے لئے گلجرے چلیں اور وہاں مرغ کی لڑائی کا تماشہ دیکھیں۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو یہ مشغلہ جاری تھا۔ اور لوگ اس کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک بازی

کٹتی تھی اور دوسری اُس کی جگہ پر آجاتی تھی۔ ہر جوڑ پر بادی لگ رہی تھی۔ ہم دیر تک یہ تماشہ دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس مجمع میں مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ تقریباً پچاس فیصدی لوگوں کے نصف نصف کان کٹے ہوئے تھے اور تعجب اس پر تھا کہ سب کے داہنے ہی کان تھے اور سب ایک ہی انداز سے کاٹے گئے تھے۔ بایں کان ہر ایک کا بالکل ثابت تھا۔ میں حیران تھا کہ یا الٰہی! یہ کیا اسرار ہے، کیا یہ سب اُسی بھوت کے ہتھے چڑھے ہوئے ہیں؟ آخر اُس بھوت کو انسان کے کان کاٹ کر کھانے میں کیا مزہ ملتا ہے کہ وہ صرف کان ہی کاٹتا ہے اور وہ بھی پورا نہیں، بلکہ نصف۔ ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔

غروب آفتاب کے قریب ہم وہاں سے واپس آئے۔ کچھ کھانا کھا کر ہم باتیں کر رہے تھے کہ مالک مکان اپنا زخمی کان باندھے ہوئے ہمارے پاس آ بیٹھا۔ میری خواہش پر اُس نے گاؤں کے چند اور بڑے آدمیوں کو بھی بلوا لیا۔ خالدو کے وساطت سے میں نے اُن سے دریافت کیا کہ یہ بھوت کا کیا معاملہ ہے۔ یہ کون ہے اور یہاں کب سے ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ تقریباً دو سال سے اس گاؤں پر یہ آفت نازل ہے۔ یہ عجیب بلا ہے اور اس کا تعلق جنّاتوں سے ہے۔ ابتداء میں ہم لوگوں نے اس کے پکڑنے اور مارنے کی

بڑی کوششیں کیں، مگر سب بیکار ثابت ہوئیں اور وہ کبھی ہمارے قابو میں نہ آیا۔ اگر وہ انسان ہوتا تو یقینی ہم اس پر قابو پا لیتے۔ لیکن جنات سے کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جنوں کی کثرت ہے، لیکن یہ بھوت عجیب قسم کا ہے ہم سب لوگوں کے دلوں پر اس کی ہیبت غالب ہے اور ہر وقت اس کا خوف لگا رہتا ہے۔ یہ سوتے ہوئے آدمیوں پر بھی آکر حملہ کرتا ہے۔ مگر بجز کان کے انسان کے کسی اور اعضاء کو نہیں کاٹتا۔ وہ جب چاہتا ہے کھڑکیوں اور چھتوں کے ذریعہ سے رات کے وقت مکانوں کے اندر بلا تکلف چلا آتا ہے اور راستہ چلتے ہوئے لوگوں پر بھی حملہ کرتا ہے البتہ عورتوں اور بچوں سے نہیں بولتا۔ یہ جنگلی بندر کی طرح چیختا ہے اور بے تحاشا تیز بھاگتا ہے اور جھیل میں کود کر خدا جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ دو سال سے مسلسل ہم سب اس کے ہاتھوں سے سخت پریشان ہیں اور عقل نہیں کام کرتی کہ اس کے حملوں سے محفوظ رہنے کی کیا تدبیر اختیار کریں۔ اس کے حادثہ سے شاذ ہی کوئی دن خالی جاتا ہو، ورنہ روزانہ کہیں نہ کہیں ہمیں اس بلائے بے درماں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ سرکاری حکام کو ہم اپنی اس مصیبت کی اطلاع دے چکے ہیں لیکن ابھی تک ہمیں اس سے نجات دینے کے متعلق کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔

ہم اسی گفتگو میں مصروف ہی تھے کہ کمرے کی جو کھڑکی سڑک کی جانب

کھلی ہوئی تھی اُس میں کچھ آہٹ معلوم ہوئی اور پھر سر نظر آیا۔ اُس کو دیکھتے ہی سب گھبرا کر بھوت، بھوت کہتے بدحواس کھڑے ہو گئے۔ میں نے فوراً پستول پیٹی سے نکال لیا جو دیوار پر لٹک رہی تھی اور پستول میں کارتوس ڈال دیئے ان کے شور مچاتے ہی وہ نیچے کود گیا۔ میں ان لوگوں کے ہمراہ باہر نکلا۔ سڑک پر کئی جگہ لوگوں میں ہنگامہ تھا اور بھوت کا ذکر ان سب کی زبان پر جاری تھا مگر بھوت غائب تھا۔

دوسرے دن صبح اس بستی میں یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ آج بھوت نے دو آدمی زخمی کر دیئے۔ یہ دونوں آدمی علی الصباح اپنے کھیتوں پر گئے تھے اور ہنوز کام شروع نہ کیا تھا کہ ان کی نگاہیں بھوت پر جا پڑیں۔ ایک شخص تو چلّا کر بدحواس اپنی جان لے کر بھاگا اور دوسرا خوف سے وہیں گر پڑا۔ بھوت نے پھرتی سے آکر پہلے تو اس گرے ہوئے آدمی کا کان کاٹ کر چبا ڈالا اور پھر اس سے فارغ ہو کر تیزی سے دوڑ کر کچھ فاصلہ پر دوسرے آدمی کو بھی جا لیا اور اس کا بھی آدھا کان کاٹ لینے اور کھا لینے کے بعد جنگل میں غائب ہو گیا۔

میری عقل حیران تھی اور کوئی بات بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ تمام بستی میں بھوت کا چرچا ہو رہا تھا اور سب کے سب اس سے بے حد خائف نظر آرہے تھے۔ ان بستی والوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ دل بے اختیار چاہتا تھا

جنگلي بهوت

بے اختیار چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کی مدد کروں اور ان بے چاروں کو اس مصیبت اور عذاب سے نجات دلاؤں۔ رات کو میں دیر تک اسی معاملہ پر غور کرتا رہا۔ میرے دل میں شبہہ پیدا ہوا کہ وہ بھوت نہیں بلکہ کوئی شریر النفس اور بدمعاش انسان ہے۔ ایک بھوت کی یہ حرکت کہ انسانی کان کاٹ کر کھا جانا، بالکل عقل سے بعید ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے اس دو سال کے عرصہ میں کسی کی جان تو نہیں لی مگر اپنی شرارت سے کان تو کاٹ لئے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کو ضرور گولی سے مار دینے کی کوشش کروں گا اور ان مصیبت کے مارے گاؤں والوں کو اس بلائے بے درماں سے نجات دلاؤں گا۔ پھر دیر تک یہ پڑھتے پڑھتے سو گیا!

اچھا ہوا، جو تو نے نکالی ہے ہم سے بیر
جیتا رہا تو سمجھوں گا اور مر گیا تو خیر

صبح کو میں نے عنایت سے کہا کہ تانبے کی کان یہاں سے چند گھنٹوں کی راہ ہے، تم خالدو کو اپنے ساتھ لے کر وہاں چلے جاؤ اور رحمت خاں کو تلاش کر کے اس سے ملو اور اگر ممکن ہو تو اسے یہاں بھی لے آؤ۔ یہ بھرا ہوا پستول احتیاطاً اپنی جیب میں رکھ لو۔ اگر وہ بھوت تمھیں راستے میں مل جائے تو تم بلا تامل اس پر فائر کر کے اس کا کام تمام کر دینا اور کمال ہوشیاری سے ادھر ادھر نظر رکھتے ہوئے راستہ طے کرنا۔ ورنہ اگر تم نے غفلت کی تو

یاد رکھو کہ بھوت کے ہاتھوں تمھارے کان کی بھی خیر نہیں۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر عنایت اور خالد دونوں منزلِ مقصود پر روانہ ہو گئے۔ ان کو رخصت کر دینے کے بعد میں تمام دن بستر پر پڑا ہوا بھوت کو مارنے اور اس کو گرفتار کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا اور یہ تجویز کرتا رہا کہ کسی طرح اُس کو زندہ گرفتار کر کے پولیس کے حوالہ کر دوں۔ لیکن یہ کام آسان اور بچوں کا کھیل نہ تھا۔ ایک مہم تھی اور کیسی کچھ سخت!

شب میں مجھے بخار آگیا۔ دوسرے دن بھی طبیعت کچھ صاف نہ تھی۔ دن میں کئی بار کافی پی، جس سے پسینہ آکر شام کو بخار اُتر گیا۔ بچارے مکان والے میاں بیوی میری خدمت کرتے رہے۔ میں نے اُن کے اصرار پر کچھ کھانا کھایا اور پڑا ہوا آرام کرتا رہا۔ عنایت کو تیسرے روز واپس آجانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ چوتھے روز شام کو واپس آیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب میں بستر پر لیٹا تو اُس نے میرے قریب بیٹھ کر عجیب قصہ بیان کیا اور وہ یہ کہ جب ہم منزلِ مقصود پر پہنچے تو ہمیں دو پنجابی چوکیدار ملے جو وہاں کمپنی کے ملازم تھے۔ وہ ہم کو اپنے ڈیرے پر لے گئے اور بڑی خاطر و تواضع سے پیش آئے۔ کھانے کے بعد اُن لوگوں نے ہم سے دریافت کیا کہ کیا تم یہاں ملازمت کرنے کی غرض سے آئے ہو؟ چوکیداری میں پچاس ڈالر ماہوار کی ایک جگہ خالی ہے اگر تمھاری خواہش ہو تو وہ جگہ مل سکتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں یہاں ملازمت کی

غرض سے نہیں بلکہ اپنے بھائی کی تلاش میں آیا ہوں۔ رحمت خاں اُس کا نام ہے وہ یہاں تین سال ہوئے اس کارخانہ میں چوکیدار ہو کر آیا تھا۔ صرف اُسی سے ملنا مقصود ہے۔ مہربانی فرما کر آپ مجھے بتلا دیجئے کہ وہ کہاں ہے۔ رحمت خاں کا نام سُنتے ہی اُن دونوں کو صدمہ ہوا اور وہ خاموش سے ہو گئے، پھر کہا کہ رحمت خاں ہمارے ہی پاس تھا، وہ ایک سال تک ہمارے ساتھ رہا۔ نہایت اچھا آدمی تھا۔ بھائیوں کی طرح وہ ہم سے محبت کرتا تھا۔

ایک روز اُس کو معمولی سا بخار آگیا۔ تیسرے دن اُس کی حالت کچھ زیادہ خراب نظر آئی تو ہم لوگوں نے ڈاکٹر کو لا کر دکھلایا۔ دوائیں پلائیں۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر بڑے زور کی چیچک نکل آئی جس کی وجہ سے کمپنی نے اُس کو آبادی سے ایک کوارٹر میں بھجوا دیا۔ ہم اُس کی وہاں بھی تیمارداری کرتے رہے اور اسی حالت میں اُس کو وہاں ایک مہینہ کا مل گزر گیا۔ چیچک سے تو اُس کو نجات مل گئی مگر اُس کی گرمی اُس کے دماغ پر مسلط ہو گئی اور افسوس کہ وہ اچھے بھلے انسان سے دیوانہ ہو گیا۔

ان دونوں چوکیداروں میں سے ایک کا نام علی بخش تھا اُس نے کہا کہ ایک روز علی الصباح کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں اُٹھ کر دروازہ کھولنے لگا کہ دیکھوں کون ہے۔ میں زنجیر کھول ہی چکا تھا کہ ایک لمبا سا ہاتھ اندر آیا اور باہر سے رحمت خاں کی آواز آئی کہ او علی بخشا! جلدی سے

دو ڈالے (ڈالر) دینا"۔ اُس نے دو تین مرتبہ اسی لو دُہرایا۔ میں نے بلا اس کا کوئی جواب دیئے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آگیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ رحمت خاں! اتنے سویرے تم کو یہ ڈالوں کی ضرورت کیا پیش آگئی؟ اُس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ تمھیں خبر نہیں ہے! میری بوڑھی ماں مجھے تلاش کرتی ہوئی پنجاب سے آگئی ہے اور ابھی جہاز سے اُتری ہے۔ وہ وہاں کنارے بیٹھی ہے۔ اب وہ آگئی ہے تو اُس کو بازار سے کچھ لاکر کھلاؤں یا نہیں؟ وہ بھوکی نہ ہوگی؟ میں نے اُس کو بٹھانا چاہا مگر وہ اپنی دُھن میں اُٹھا اور باہر بھاگ گیا۔ پھر اُس نے سرکاری کوارٹر بھی چھوڑ دیا اور کہیں جنگل میں جاکر رہنے لگا۔ ہم نے اُس کو بہتیرا تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا اور مایوس ہوکر بیٹھ گئے۔

متذکرۂ بالا واقعہ کے دو ماہ بعد ایک روز ہم دونوں آدمی کمپنی کے پھاٹک پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک ہماری نگاہیں رحمت خاں پر پڑیں کہ وہ دوڑتا ہوا ہماری طرف آرہا ہے۔ اب اُس کی شکل و صورت بدل کر عجیب خوفناک ہوگئی تھی اور وہ بھوت کا ایک مجسمہ نظر آرہا تھا۔ اُس کی صورت سے دہشت اور وحشت برس رہی تھی۔ آنکھیں سُرخ تھیں۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھ گئے تھے۔ وہ آکر ہمارے سامنے والی بنچ پر بیٹھ گیا اور مجھ کو گھور کر دیکھنے لگا غصہ میں اُس کے مُنھ سے کف جاری ہوگیا اور آنکھیں غضبناک۔ مجھے اُس کی

یہ حالت دیکھ کر خوف معلوم ہونے لگا۔ وہ غصہ میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "او علی بخشا! تو بڑا بے ایمان اور شیطان ہے۔ دیکھ تو نے میرا یہ داہنا آدھا کان کاٹ کر کھا لیا ہے۔ دیکھ یہ میرا کان کٹا ہوا ہے (اُس کے دونوں کان ثابت تھے) میں بھی راجپوت بچہ نہیں اگر تیرے کان سلامت چھوڑ دوں"۔ یہ کہتے ہی اُس نے ایک جست لگا کر مجھے آ دبوچا۔ میں نے سنبھلنے اور اُس سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد وہ اپنے تیز دانتوں سے میرا داہنا نصف کان کاٹ کر بھاگ گیا۔ اس واقعہ کو دو سال گزر چکے ہیں، پھر ہم نے اُس کی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ وہ انھیں جنگلوں میں کہیں ہوگا اور یا پھر مر گیا ہوگا۔ اگر اچھا ہوتا اور زندہ ہوتا تو ہم لوگوں سے ضرور آکر ملتا۔ اس وقت تمھارے آنے سے اُس کی یاد تازہ ہو گئی اور ہمیں دلی صدمہ ہوا۔

عنایت سے یہ واقعات معلوم ہونے کے بعد اب شک و شبہہ کی گنجائش نہ تھی کہ یہ بھوت وہی ہمارا رحمت خاں ہے جس کو وہم ہو گیا ہے کہ علی بخش نے اُس کا کان کاٹ کر کھا لیا ہے۔ چنانچہ اب اسی وہم میں وہ دوسروں کے کان کاٹ کر کھا جایا کرتا ہے۔

اللہ اللہ! انسان کے ساتھ بھی دنیا میں کیا کیا واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور باوجود اس کے زیرک و دانا ہونے کے یہ اس سے قطعی بے خبر ہے کہ

کل کیا ہونے والا ہے۔ اب رحمت خاں کی حالت بھی دراصل قابلِ رحم تھی۔ وہ غریب الوطن تھا اور گھر بار چھوڑ کر محض چند سفید ٹکلیاں کمانے کی خاطر یہاں آپڑا تھا۔ اُس کی حالت کیا تھی اور اب یہاں کیا ہوگئی۔ یا تو میں بھوت کے خون کا پیاسا تھا اور یا عنایت سے یہ حالات معلوم ہوکر اب اُس کی موجودہ حالت پر مجھے بے انتہا افسوس اور صدمہ تھا۔ عنایت کے دل کی تو جو کچھ حالت نہ ہوتی کم تھی۔ آخر بھائی تھا، خون تھا۔ بات کرتا تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکے پڑتے تھے۔ آہ! اس غریب کی بوڑھی ماں یہ آسرا لگائے زندگی کے دن بُری بھلی طرح کاٹ رہی ہوگی کہ اس کی آنکھوں کا تارہ، اکلوتا لعل پردیس سے کما کر واپس آتا ہوگا۔ مگر یہاں رحمت خاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہوش و حواس سب کھو بیٹھا تھا۔ ہائے رے انسانی بے چارگی!

اب میرے سامنے مشکلیں درپیش تھیں۔ نہ تو رحمت خاں کو اُس کی اس زبوں حالی میں چھوڑ کر واپس جاتے بنتا تھا اور نہ اُس کو حقیقتاً بھوت سمجھ کر اُس کی جان لینے کا خیال کرسکتا تھا۔ مجھے اُس سے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور یہ بھی فکر تھی کہ اُس کی ان حرکتوں سے جو اُس کی بدحواسی میں سرزد ہو رہی ہیں اس سے گاؤں والوں کو نجات مل جائے اور اس کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ کسی طرح رحمت خاں کو زندہ گرفتار کرلیا جائے اور یہ جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں کوئی آسان کام نہیں ہے۔

آخر یہی فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُس کو زندہ گرفتار کرکے زنبونگا کے جیل یا پاگل خانہ کے ہسپتال میں داخل کردیا جائے اور وہاں اسکی دماغی حالت درست کرنے کی کوشش ہو، بہت ممکن ہے کہ وہ تندرست ہو جائے۔ اس کے گرفتار کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ میری یہی خواہش تھی کہ وہ ایسے وقت میں گرفتار ہو کہ ہم اُس کو لے کر فوراً روانہ ہو سکیں نیز یہ کہ اس کو بستی میں نہ لایا جائے ورنہ گاؤں والے جنھوں نے اسکے ہاتھوں ایذا اُٹھائی ہیں اس کو زندہ نہ چھوڑینگے

میں نے مضبوط رسّوں کا انتظام کیا اور خالدو کے ذریعہ سے ایک آدمی اور فراہم کرلیا۔ اس طرح اب ہم چار آدمی ہو گئے۔ ہم سب نے جھیل کے قریب جنگل میں جو اس کی آمد ورفت کا عموماً راستہ تھا جھاڑیوں کے اندر چھپ کر بیٹھنے کا بندوبست کیا۔ ہم نے اپنے ساتھ ناشتہ بھی لے لیا تاکہ دن بھر ہم وہاں بہ اطمینان بیٹھ سکیں۔ رائفل اور پستول بھر کر میں نے اپنے پاس رکھ لی۔ اتفاق سے ہم جلد کامیاب ہو گئے۔ ہمیں بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ رحمت خاں دُور سے جنگل سے نکلکر اسی طرف آتا ہوا نظر پڑا۔ یہی اس کا راستہ تھا۔ میں نے عنایت سے کہہ دیا کہ جیسے ہی سیٹی کی آواز سنو، تم دونوں آدمیوں کو لیکر جھاڑی سے نکل آؤ۔ اور خود رائفل لے کر راستہ کے قریب ایک درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ جب

رحمت خاں میرے نزدیک پہنچ گیا تو میں فوراً نکل کر اُس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور للکار کر کہا کہ رحمت خاں خبردار! خاموش کھڑے رہو۔ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو گولی سے مار دیئے جاؤ گے۔ یہ سُنکر وہ غضبناک ہو گیا اور سُرخ آنکھیں نکال کر شیر کی طرح غرّانے اور اپنے ہاتھوں کے بڑے بڑے ناخن نکالکر مجھے ڈرانے لگا۔ ہمارے سامنے درخت پر بندر اُچھل کود رہے تھے میں نے رحمت خاں کو خوف زدہ کرنے کے لئے ایک بڑے بندر پر گولی چلائی جس کے لگتے ہی وہ نیچے گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ فائر کی آواز اور بندر کی موت کا اُس کے دل پر کافی اثر ہوا۔ اب اُس کا غرّانا بند تھا اور مرعوب نظر آ رہا تھا۔ میں نے فوراً رائفل کی نال اُس کے سینہ کی طرف کر دی۔ وہ خوف سے کانپنے لگا میں نے سیٹی دی۔ عنایت کے ساتھ دونوں آدمی باہر آ گئے اور پُشت کی جانب سے اُسکو پکڑ کر مضبوطی سے اُس کی مشکیں کس دیں۔ پھر اُس کے مُنھ پر ٹاٹ کا ٹکڑا باندھ دیا تاکہ وہ اپنی عادت کے مطابق کسی کے کان نہ کاٹ سکے اس کے بدن کے ٹاٹ کے ٹکڑے کو بھی جو ستر پوشی کر رہا تھا درست کر دیا گیا ازاں بعد ہم اس کو لے کر واپس روانہ ہو گئے اور مقامی آدمی کو اُسکی اُجرت دیکر رخصت کر دیا۔ اُس کی چال دھیمی تھی کبھی کبھی رُک جاتا اور چلتے چلتے بیٹھ بھی جاتا تھا۔ جب اُس کو کھینچا یا ڈھکیلا جاتا تو پھر چلنے لگتا۔ اُس کی یہ حالت دیکھی تو میں اُس کو عنایت کو سپرد کر کے خود تیز قدمی سے کاٹو باٹا کی

طرف روانہ ہوگیا اور کہدیا کہ میں چل رہا ہوں تم اس کو باحتیاط لے کر کاٹوباٹا آجاؤ۔ راستہ میں ایک لڑکا مل گیا تھا، سامان اُس کے حوالے کرکے ساتھ لے لیا۔ میں نے دوسرے دن کاٹوباٹا پہنچکر ایک بادبانی جہاز کا زنبونگا تک کے سفر کے لئے انتظام کرلیا تاکہ عنایت وغیرہ کے پہنچتے ہی ہم جہاز پر سوار ہوکر روانہ ہوجائیں۔ چنانچہ عنایت کے آتے ہی ہم سیدھے جہاز پر پہنچے اور تیسرے دن زنبونگا آگئے۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں رحمت خاں کو بند کردیا گیا۔ پھر میں قادر خاں کو ہمراہ لیکر سپرنٹنڈنٹ جیل سے جاکر ملا اور اُن سے تمام کیفیت من وعن بیان کی۔ اُنھوں نے ازراہِ ہمدردی رحمت خاں کو جیل کے ہسپتال میں رکھکر علاج کرنے کی منظوری دیدی اور مجھے اطمینان دلایا کہ اگر ضرورت پیش آئی تو مریض کو علاج کے لئے منیلا کے بڑے ہسپتال میں منتقل کردیا جائے گا۔ چنانچہ اُسی وقت اُنھوں نے جیل کی گاڑی بھیجکر رحمت خاں کو بلوالیا اور ہسپتال میں داخل کردیا۔

اب میں یہاں سے منیلا جانا چاہتا تھا، جس کی تیاری شروع کردی۔ پوہول برادرس کے منیجر سے ملا اور اُن سے اپنی امانت تھیلی واپس لے لی۔ کچھ عنایت کی خواہش پر کچھ عرصہ کے لئے زنبونگا میں قادر خاں کے پاس رہنے کی اُس کو اجازت دیدی۔ بات یہ تھی کہ وہ رحمت خاں کو اس حال میں چھوڑکر یہاں سے جانا نہ چاہتا تھا اور اُس کی جانب سے مزید اطمینان حاصل کرلینا چاہتا تھا۔

چونکہ خون کا جوش ایک قدرتی امر تھا اس لئے میں نے بھی اپنے ساتھ چلنے پر اُس کو مجبور نہیں کیا اور کافی سرمایہ دیدیا کہ وہ اُس سے وہاں رہ کر کچھ کاروبار کرتا رہے۔

سٹیمر آنے پر میں تنہا منیلا روانہ ہوگیا۔ تیسرے دن جہاز جزیرہ صیبو میں پہنچکر لنگر انداز ہوا۔ میں خشکی میں اُتر کر دو تین گھنٹے شہر میں گھومتا پھرتا رہا۔ یہ شہر اگرچہ بڑا نہیں ہے لیکن پھر بھی بارونق ہے۔ ہیمپ بہ افراط پیدا ہوتا ہے اور اسی لئے اس کے یہاں متعدد کارخانے ہیں جن میں جہازوں کے رسّے تیار ہوتے ہیں۔ اسکول بھی کافی ہیں جن میں جوان لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں انگلش بھی پڑھائی جاتی ہے اور یہ انگلش میں گفتگو کر لیتے ہیں۔

ہمارا جہاز اسی طرح کئی جزیروں میں ٹھہرتا ہوا آٹھویں روز فلپائن کے صدر مقام اور مشہور شہر منیلا میں پہنچا اور پلیٹ فارم سے لگا دیا گیا، ہم آسانی سے اُتر کر شہر میں داخل ہوگئے اور شہر کے عین وسط میں ایک فلپینو ہوٹل میں جاکر مقیم ہوگئے۔ یہاں عام طور پر لوگ انگلش بول لیتے ہیں۔ میں تھوڑی سی سپینش زبان سیکھ گیا تھا جو یہاں کی عام زبان ہے۔

منیلا نہایت خوبصورت، بارونق اور بڑا شہر ہے۔ امریکہ گورنمنٹ نے زر کثیر صرف کرکے اس کو بالکل امریکہ کا ایک شہر بنا دیا ہے۔ دریائے پاسگ شہر کے درمیان میں ہوکر گذرتا ہے جس سے شہر کی رونق اور بھی دوبالا ہوگئی ہے

دریا کے دونوں جانب خوبصورت عمارتیں ہیں۔ اور دریا میں ہر وقت چھوٹے بڑے سٹیمروں اور کشتیوں کی آمدورفت سے بڑی بہار رہتی ہے۔ الیکٹرک ٹریموے شہر کے بازاروں اور دیگر حصوں میں جاری ہے۔ شہر کی کی آبادی تین لاکھ سے زائد ہے۔ اسکولٹا اور روساریو یہاں کے مشہور بازار ہیں جن میں بڑی بڑی بارونق دکانیں ہیں۔ رات کو بجلی کی روشنی سے سارا شہر جمگگا اٹھتا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹل ہیں۔ ریسٹاران ہیں۔ بنک ہیں۔ یہاں کے لوگ سیر و تفریح کے بڑے دلدادہ ہیں۔ بہت سے ناچ گھر ہیں بکھرے ہیں۔ کم و بیش سارے شہر ایک سو کے قریب سینما ہیں اور جس میں جاکر دیکھو ہال خالی نظر نہیں آتا۔ غیر ممالک کے باشندوں میں امریکن۔ سپینش۔ انگریز۔ جرمن۔ جاپانی اور چینی بکثرت آباد ہیں پنجابی بھی خال خال نظر آتے ہیں کچھ سندھیوں کی دکانیں بھی ہیں۔

یہاں سگرٹ اور سیگار بنانے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں جہاں بہت سی مشینیں چلتی رہتی ہیں اور ہزاروں مردوں اور عورتوں کی روزی کا ذریعہ ہیں۔ یہاں کا سیگار دنیا میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ میں نے ذاتی طور پر بھی ان کارخانوں کو اندر جاکر دیکھا مشینوں کے مختلف کام دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ایک ماہ تک میں نے یہاں قیام کیا۔ طبیعت کو بیکاری سے بہت

اُلجھن ہو رہی تھی اور ہر وقت اُن کے آمد کا انتظار رہا کرتا تھا کہ خلافِ اُمید اُس کا خط ملا جس میں اُس نے لکھا کہ وہ چند دنوں اور زنبونگا میں قیام رکھنا چاہتا ہے۔ میں بلا مشغلہ اُکتا گیا تھا، اب اُس کا زیادہ انتظار دوبھر نظر آنے لگا اس لئے میں مکمل تیاری کر لینے کے بعد تنہا ہی امریکہ روانہ ہو گیا۔

گھر سے روانہ ہونے کے بعد اگرچہ ایک سال اتفاقات زمانہ کے ہاتھوں کیسے راستہ میں گزارنے پڑے لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے ارادے اور اپنی اسکیم میں پورے طور پر کامیاب ہوا۔ سچ یہ ہے کہ:۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود مرد باید کہ ہراساں نہ شود

اس کے بعد کے حالات، واقعات اور حادثات اور بھی زیادہ دلچسپ ہیں، وہ انشاء اللہ عنقریب اس کے تیسرے حصہ میں آپ کے ملاحظہ سے گذریں گے اس وقت اس کو یہیں پر ختم کر کے خدا حافظ کہتا ہوں۔

خاکسار

سید محمد علی شاہ سبزواری

ڈنٹیل کالج۔ آرہ (بہار)